پانچویں سالانہ اجلاس کی کاروائی

پائیدار ترقی کی بنیاد عوامی شعور، جدوجہد اور فیصلہ سازی

پاکستان کسان مزدور تحریک

2012، رینیول سینٹر، لاہور

پائیدار ترقی کی بنیاد
عوامی شعور، جدوجہد اور فیصلہ سازی
پاکستان کسان مزدور تحریک
پانچواں سالانہ اجلاس

پانچویں سالانہ اجلاس کی کاروائی

پائیدار ترقی کی بنیاد عوامی شعور، جدوجہد اور فیصلہ سازی

پاکستان کسان مزدور تحریک

10-11 دسمبر، 2012

پاکستان کسان مزدور تحریک

روٹس فار ایکوٹی نے 2008 میں کسانوں، ہاریوں کے سیاسی و معاشی حالات کے ادراک اور اس کی بنیاد پر کسانوں کو منظّم کرنے کے لیے ملک گیر سطح پر ایک سیاسی تعلیمی پروگرام کا آغاز کیا۔ سیاسی تعلیمی آگہی کے اس پروگرام کا مقصد ہاریوں اور بے زمین کسانوں کو زرعی مسائل کے حوالے سے ایک پلیٹ فارم پر منظّم کرنا تھا تاکہ ان کے مسائل کے حل کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جاسکے۔ اس پروگرام کے تحت کسان مزدوروں کے حقوق، خوراک کی خودمختاری اور پائیدار زراعت کے موضوعات پر تفصیلی پروگرام ترتیب دیے گئے۔

پہلے مرحلے میں اس پروگرام کا آغاز ملک کے تین صوبوں (سندھ، پنجاب اور خیبر پختون خواہ) کے دو دو اضلاع سے کیا گیا۔ بعد میں چند سالوں کے لیے بلوچستان کو بھی اس عمل میں شامل کیا گیا۔

سیاسی تعلیمی آگہی کے پروگرام کے دوسرے مرحلے میں صوبائی سطح پر تربیتی پروگرام کا آغاز کیا گیا جس کے نتیجہ میں تمام صوبوں میں صوبائی کور گروپس کی تشکیل عمل میں آئی۔ صوبائی کور گروپ صوبہ بھر میں اپنے کام کو پھیلانے کا ذمہ دار قرار پایا۔

آج پاکستان کسان مزدور تحریک ملک کے 16 اضلاع میں موجود ہے اور اس کے کارکنان کسانوں خاص طور پر بے زمین کسانوں کے ساتھ مختلف حوالوں سے سرگرم عمل ہیں۔ جن میں سیاسی شعور، عملی جدوجہد اور تحقیقی سرگرمیاں شامل ہیں۔

پی کے ایم ٹی کا پہلا سالانہ اجلاس پاکستان کسان سنگت کے نام سے 2008 میں لاہور میں منعقد ہوا، جس میں چاروں صوبوں سے تقریباً 100 کسانوں نے شرکت کی۔ 2009 میں اس اتحاد کے باقاعدہ نام پر ابتدائی بحث و مباحثہ کا آغاز کیا گیا۔ جب کہ 2010 کے سالانہ اجلاس میں اس اتحاد کا نام متفقہ طور پر پاکستان کسان مزدور تحریک طے پایا جس میں چاروں صوبوں سے ایک ایک صوبائی کوارڈینیٹر کا چناؤ بھی عمل میں آیا۔ 2008 سے تحریک کا سالانہ اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہورہا ہے۔ 2009 کے سالانہ اجلاس میں مرکزی رابطہ کار کا چناؤ کیا گیا۔ موجودہ اشاعت میں 2012 کے سالانہ اجلاس کا ایک جائزہ ہے۔

ابتدائی تقریب

پاکستان کسان مزدور تحریک کی پانچویں سالانہ کانفرنس رینیول سینٹر، لاہور میں 10 اور 11 دسمبر 2012 کو منعقد ہوئی۔ اس میں چاروں صوبوں سے چھوٹے اور بے زمین کسانوں اور مزدوروں نے شرکت کی۔ کانفرنس کا آغاز ٹیبلو سے کیا گیا جس میں غیر ملکی کمپنیوں کی اجارہ داری کو غریب کسانوں پر مسلط ہوتے ہوئے دکھایا گیا کہ کس طرح ان غیر ملکی کمپنیوں نے چھوٹے کسانوں کو خوشحالی کا جھانسہ دے کر ہوئے کسانوں اور زرعی نظام کو نہ صرف مفلوج کیا بلکہ غیر اخلاقی اور غیر قدرتی طریقوں سے پیدا کیے گئے بیجوں سے ماحول، انسانی صحت اور زمین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ پیش کردہ ٹیبلو میں یہ پیغام دیا گیا کہ کس طرح چھوٹے کسان یکجا ہو کر ان غیر ملکی کمپنیوں کی غلامی کی زنجیریں توڑتے ہوئے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

تعارفی کلمات

اسٹیج سیکرٹری کے فرائض پی کے ایم ٹی صوبہ پنجاب ملتان کے ممبر ظہور جوئیہ نے ادا کیے اور کانفرنس کے پہلے دن کا آغاز کرتے ہوئے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ تعارفی کلمات ادا کرنے کے لیے پاکستان کسان مزدور تحریک کے قومی رابطہ کار علی اکبر اور روٹس فار ایکوٹی کی چیئر پرسن نوین جی حیدر کو دعوت دی گئی۔

نوین جی حیدر نے تمام شرکاء کو پاکستان کسان مزدور تحریک کے پانچویں سالانہ اجلاس میں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ آج میں بڑی تعداد میں یہاں نوجوانوں کو دیکھ رہی ہوں۔ یہ نوجوان ہی ہیں جن کا جذبہ جنون ہماری کامیابی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جتنی نوجوانوں کی قوت اور ان کا جذبہ شامل ہوگا اتنی ہماری تحریک آگے بڑھے گی۔ آج کے اجلاس کا عنوان ''پائیدار ترقی کی بنیاد عوامی شعور، جدوجہد اور فیصلہ سازی'' ہے۔ اس موضوع کے تحت اس فورم سے آج ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ ہمارے مقررین میں خاص طور پر ڈاکٹر روبینہ سہگل صاحبہ ہیں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی شرکت اور مختلف موضوعات پر معلومات فراہم کرنا ہماری خوش قسمتی ہے۔ اس کے علاوہ پی کے ایم ٹی کے ساتھیوں

کے تجربات سے ہم بہت کچھ سیکھ کر کام کرنے کی ایک نئی سوچ اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ ہمارا فورم صرف سوچنے کا نہیں ہے، ہم عمل میں بھی بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہم آج کے اس اجلاس میں یہ طے کریں گے کہ اس تحریک کو کس طرح مزید آگے بڑھانا ہے۔

پی کے ایم ٹی کے قومی رابطہ کار علی اکبر نے چاروں صوبوں کے شرکاء کو خوش آمدید کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے سال یا اس سے پہلے جتنی بھی خامیاں ہوئیں ہمیں ان کو دور کرتے ہوئے کام کو آگے بڑھا نا ہے۔ میں بحیثیت قومی رابطہ کار آپ لوگوں سے پہلی بار مخاطب ہوں اور شاید آخری بار بھی کیونکہ ہم ایک سلسلہ وار قیادت کا عمل شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اس تبدیلی کے عمل کو ہم صوبائی اور ضلعی سطح پر سلسلہ وار آگے بڑھائیں گے۔ سبز انقلاب کا تصور، بیج اور خوراک کی خود مختاری کی سیاست میں نے یہاں سے سیکھی۔ اب اس کو اپنا کر جتنا مجھ سے ممکن ہو آگے لے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ چند لوگوں اور این جی اوز مافیا نے پورے ملک کی سیاسی تحریکوں اور مضبوط پریشر گروپس کو توڑنے میں کردار ادا کیا ہے۔ ان تحریکوں کے کارکنان کو مافیا نے اپنے ساتھ ملا کر سیاسی سرگرمیوں کے بجائے سماجی سرگرمیوں کو فروغ دیا جس سے ناکامیوں میں اضافہ ہوا۔

ہم کسان مزدور تھے۔ این جی اوز نے زیادہ تنخواہیں دے کر پڑھے لکھے نوجوان اور عقل وفہم والے وہ لوگ ہم سے لے لیے جن سے بنیادی باتیں سیکھ کر ہم دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ یہ تحریک اس وقت کامیاب ہوگی جب ہم ہر ضلع اور ہر جگہ پر سیاسی کارکن پیدا کرلیں گے۔ جب تک ہمارے پاس سیاسی کارکن نہیں ہونگے یہ کام آگے نہیں بڑھے گا۔ میں بحیثیت قومی رابطہ کار تو کام نہیں کروں گا پر اپنے ضلع اور ضلعی رابطہ کاروں پر پوری توجہ دوں گا، میری یہ تجویز آپ کو بھی ہے۔ سندھ ہو یا خیبر پختونخواہ، جتنی بھی تحریکیں کامیاب ہوئیں ان پر بھرپور توجہ دی گئی تھی۔ پنجاب کے شہر اوکاڑہ میں عورتوں اور مردوں نے فوج کے خلاف جدوجہد کی جسے لوگ بہت عرصہ تک یاد رکھیں گے اور اس سے سبق حاصل کریں گے لیکن اس تحریک پر توجہ نہیں دی گئی اور آج وہ ٹکڑوں میں بٹنے لگے ہیں۔ اگر کوئی روائتی بیج کو اپناتا ہے، یا کوئی ہائبرڈ بیجوں اور کمپنیوں کے خلاف کام کرتا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہو اور پی کے ایم ٹی کے ممبر نہ بھی ہو تو ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیے اور ایسے لوگوں کو سراہتے ہوئے آپس میں جوڑنا چاہیے کیونکہ آخر میں ان کو ہمارے ساتھ ہی ملنا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جب تک سرمایہ داری، سامراجیت اور طبقاتی نظام موجود ہے، ظلم رہے گا۔ کارپوریٹ فارمنگ اور تجارت مضبوط ہوتی جارہی ہیں اور ہم بٹ کر کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ ہمیں منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم بہت طاقتور ہیں۔ مجھے وال اسٹریٹ کے خلاف وہ نعرہ بہت اچھا لگا کہ ہم ملین میں ہیں اور وہ ایک ہے۔ ہماری

کمزوری یہ ہے کہ ہم میں اتحاد نہیں ہے، ہم بکھرے ہوئے ہیں، جبکہ سرمایہ دار طبقے میں اتفاق ہے۔ ہمیں اتحاد اور وسیع القلبی کی طرف جانا ہے۔ جو بھی ہمارے نظریہ کے مطابق کام کر رہا ہے اس کو سراہنا اور مضبوط کرنا ہے۔ پی کے ایم ٹی واحد تنظیم ہے جو ثابت قدمی سے کام کر رہی ہے۔ ہمیں سیاسی لوگ پیدا کرنے یا ڈھونڈنے ہیں تا کہ اگر اجلاس میں آنے کے وسائل نہ بھی دیئے جائیں تو ہم لوگ اپنے بل بوتے پر آسکیں۔ ہماری رابطہ کاری بہت کمزور ہے۔ ایک منظّم انداز سے رابطہ کاری کو مضبوط کرتے ہوئے ہمیں سیاسی سرگرمیوں کو بڑھانا ہے۔ اگر 100 لوگ بھی منظّم انداز میں رابطہ کاری کے ذریعے اس تحریک کو شروع کریں تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ نوجوانوں کی تعداد آج زیادہ ہے۔ آج میں اعلان کرتا ہوں کے میں دوسال میں ڈسٹرکٹ چارسدہ سے نوجوانوں کی ایک تنظیم بنا کر دوں گا۔ ہمارے اور حکمرانوں کے درمیان خلیج بڑھتی جارہی ہے۔ ہمارا ملک انارکی (لاقانونیت) کی طرف جارہا ہے۔ ہمارے پاس منظّم قوت نہیں کہ اس لاقانونیت سے بچ سکیں۔ ہمیں مایوسیوں سے نکلنا ہوگا، اس کے لیے صرف منظّم ہونے کی ضرورت ہے۔

پائیدار ترقی

کسان کی نظر میں پائیدار زراعت

محمد صابر

کسانوں کی نقطہ نظر سے پائیدار زراعت پر روشنی ڈالنے کے لیے ضلع راجن پور سے پی کے ایم ٹی کے ممبر محمد صابر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پہلے جب ہم فصل کاشت کیا کرتے تھے تو اس میں کھاد، ادویات وغیرہ کا بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ لیکن پچھلے دوسالوں سے ہم نے ان کا استعمال بہت کم کر دیا ہے۔ پہلے کپاس کی کاشت میں 6 ایکڑ پر کھاد کی کئی بوریاں لگ جاتی تھی۔ اس دفعہ ہم نے صرف 3 بوری کھاد استعمال کی جس سے 26 من کپاس پیدا ہوئی۔ ہم کچھ سالوں سے کھاد اورادویات کا استعمال کم کرتے جارہے ہیں۔ ہم روائتی طریقہ کاشت کی طرف جارہے ہیں۔ ادویات اور کھاد کے بجائے اگر روائتی طریقہ سے فصل کاشت کی جائے تو لاگت کم آتی ہے۔ راجن پور میں پاکستان کسان مزدور تحریک کے ممبران نے کمپنیوں کی چیزوں کا استعمال بہت کم کردیا ہے۔ تبدیلی کا عمل بار بار دہرانے سے ہوتا ہے۔ صرف ایک دفعہ حرکت میں آنے سے تبدیلی ممکن نہیں۔ تبدیلی ایک عمل سے گزرنے کا نام ہے۔ مجھے امید ہے کہ تبدیلی ضرور آئے گی۔

پائیدار ترقی: طبقاتی جائزہ

روبینہ سہگل

ڈاکٹر روبینہ سہگل نے پائیدار ترقی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ پائیدار ترقی کے تصور کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ پائیدار ترقی کے بنیادی نکات کیا ہیں؟ 1992 میں برازیل کے شہر ریو کے مقام پر اقوام

متحدہ کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس کو ارتھ سمٹ (Earth Summit) کہا جاتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے ممالک کے سربراہان نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں ایجنڈہ 21 پر بات ہوئی۔ اس جگہ سے پائیدار ترقی کا تصور مستند طریقے سے ابھرنا شروع ہوا۔ 1972 میں ایک کتاب The Limits of Growth کے نام سے لکھی گئی یعنی ترقی کی حدود ہیں۔ شرح نمو کی کچھ حدود ہیں۔ جتنی تیزی سے ترقی کا عمل اور زمین کے ذخائر کا استعمال ہوگا، اتنی تیزی سے آلودگی پھیلے گی اور ماحول تباہ ہوتا جائے گا۔ 1987 میں ایک تحریر لکھی گئی کہ پائیدار ترقی وہ ہے جس میں ذخائر کا اس طرح استعمال کیا جائے کہ موجودہ زمانے کی ضروریات بھی پوری ہوں اور ساتھ ساتھ آنے والی نسلیں بھی ان ذخائر سے وہ اپنی ضروریات پوری کرسکیں۔ اس تحریر کے تین بنیادی نکات تھے جن پر زور دیا گیا:

1۔ معاشی خوشحالی
2۔ ماحول
3۔ عدم برابری/ناہمواریاں

سماج میں طبقاتی عدم برابریاں بڑھ رہی ہیں۔ معاشرے کا ایک طبقہ بہت محنت کر رہا ہے لیکن اسے خوراک اور سہولتیں میسر نہیں جبکہ دوسرے طبقے کو محنت نہ کرنے کے باوجود خوراک بھی میسر ہے اور وہ سہولیات بھی زیادہ استعمال کر رہا ہے۔ دنیا کے 80 فیصد وسائل صرف 20 فیصد لوگ استعمال کرتے ہیں۔ امیر ملکوں میں ہونے والی ترقی کے باعث دنیا کی زمین تیزی سے استعمال ہو رہی ہے۔ 1992 ریو کے سربراہی اجلاس میں چار چیزیں طے کی گئیں:

1۔ اچھا معیار زندگی۔
2۔ آنے والی نسلوں کی ضروریات کا خیال۔
3۔ مساوات اور انصاف۔
4۔ آنے والی نسلوں کے لیے کرہ ارض کو سنبھالنا۔

اس سربراہی اجلاس میں ایک اصول طے ہوا جسے "Polluter Pays" کہتے ہیں۔ یعنی ''جو آلودگی پھیلائے وہ خمیازہ ادا

کرے''۔ اس اصول کے مطابق یہ طے ہوا کہ جو ممالک ماحول کو زیادہ آلودہ کریں گے وہی اس کی قیمت ادا کریں گے لیکن ہوتا یہ تھا کہ ماحول کو آلودہ کرنے والے امیر ممالک اور ان کے عوام تھے لیکن اس کی قیمت غریب ممالک کے عوام ادا کرتے تھے۔ اس مسئلے کا بیس سال گزرنے کے بعد دوسری کانفرنس ریو+20 میں پھر سے جائزہ لیا گیا۔ دنیا کی معیشت بنیادی طور پر سرمایہ داری نظام پر مبنی ہے۔ یعنی ایک شخص پیداواری ذرائع پر قابض ہے جبکہ دوسرے شخص کے پاس صرف اس کی محنت ہے۔ اس کی محنت سے سرمایہ دار کا منافع بنتا ہے جس کے بدلے وہ اسے تھوڑی بہت اجرت دیتا ہے تاکہ وہ پھر سے کام پر آسکے اور زندہ رہ سکے۔ باقی منافع وہ سرمایہ دار استعمال کرتا ہے اور اس سے مزید سرمایہ بنا کر امیر بنتا جاتا ہے۔ یعنی جیسے جیسے وہ امیر ہوتا ہے، مزدور غریب ہوتا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کی بنیاد اضافی پیداوار پر ہے۔ سرمایہ دار مشینوں کی وجہ سے اضافی پیداوار کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس عدم برابری کے باعث ایک مزدور طبقہ اور دوسرا سرمایہ دار طبقہ جنم لیتا ہے۔

یہ عالمی نظام پوری دنیا میں رائج ہے۔ 2008 میں اس نظام میں بڑے بڑے بحران آئے۔ اس کی وجہ بڑے بڑے بینکرز اور سرمایہ دار تھے جو لوگوں کو گھروں کے لیے قرضہ دیتے تھے۔ ستمبر 2008 کو دنیا کا عالمی معاشی نظام ختم ہونے لگا تھا، تب امریکہ نے 700 ارب ڈالر ایک دم اس نظام میں ڈالے۔ یوں عوام کے پیسوں سے ہی ان کمپنیوں اور کارپوریشنز کو بچایا گیا۔ ابھی تک کئی یورپی ممالک میں، جن میں جرمنی، فرانس، اٹلی، آئرلینڈ، اسپین شامل ہیں، قرضوں کا زبردست بحران جاری ہے۔ ان ممالک نے ترقی اور بلند معیار زندگی کے نام پر اتنا پیسہ خرچ کیا ہے کہ اب وہ اس قرضے کو واپس ادا نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس بحران سے نکلنے کے لیے اس کے ذمہ داروں کو سزا نہیں دی گئی بلکہ ریاستوں نے پیسے ڈال کر اس نظام کو بچا لیا کیونکہ ریاست کے اوپر بھی انہی طبقوں کا قبضہ ہوتا ہے اور وہی اس طبقے سے کام لے رہے ہوتے ہیں۔ ہماری ریاست پر فوج، جاگیردار اور خان قابض ہیں۔ یہی لوگ پارلیمنٹ میں بھی ہیں جہاں یہ قانون اور پالیسیاں بناتے ہیں۔ یہ لوگ زرعی آمدنی پر ٹیکس نہیں لگنے دیتے، اسٹاک مارکیٹ میں پیسہ بناتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی وہ طبقہ ہے جو انہیں بچاتا ہے۔ ریاستوں نے بھی مداخلت کر کے بڑے بینکوں اور کارپوریشنز کو بچایا ہے۔

اس بحران کے دوران ایک اور مسئلہ بھی سامنے آیا جو مزدوروں اور کسانوں پر اثر انداز ہوا کہ خوراک اور ایندھن کی قیمتیں آسمان پر پہنچ گئیں، کیونکہ سرمایہ داروں نے خوراک کی فصلوں سے ایندھن بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح خوراک کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ پوری دنیا میں پانی، خوراک اور توانائی کا بحران شروع ہوا تو پوری دنیا کو احساس ہوا کہ یہ وسائل تیزی سے ختم ہو رہے ہیں اور ہم زیادہ دیر تک ترقی کے نام پر ان کا استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ اگر ایسا ہوتا رہا

تو کچھ طبقے ان وسائل سے بالکل محروم ہوجائیں گے اور قحط بڑھ جائے گا۔ امیر ممالک نے الزام عائد کیا کہ غریب ممالک کی آبادیاں زیادہ ہیں اس لیے خوراک کی کمی ہے۔ یہ الزام سراسر غلط ہے، کھا تو یہ 20 فیصد طبقہ رہا ہے۔ غریب زیادہ بچے اس لیے پیدا کرتا ہے کیونکہ یہاں غربت اور بیروزگاری ہے جس کی وجہ سے زیادہ تر بچے ان سرمایہ داروں کے مزدور بن جاتے ہیں۔ ایک خاص نظریے کے تحت کسی خاص مسئلہ کو ابھارا جاتا ہے تاکہ یہ حقیقت عوام پر عیاں نہ ہو کہ ترقی یافتہ ممالک آلودگی کے ذمہ دار ہیں۔ اگر دولت کی تقسیم منصفانہ بنیادوں پر ہوگی تو آبادی بھی کم ہوگی۔

ان کارپوریشنز سے کہا جاتا ہے کہ آلودگی کم کرنے کے لیے وہ کچھ قیمت ادا کریں۔ امیر ممالک اس نام پر جو قیمت ادا کرتے ہیں اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس وقت پوری دنیا میں معاشی طور پر جی ڈی پی اور گروتھ پر زور دیا جارہا ہے۔ یعنی ایک ملک میں خدمات کتنی پیدا ہوئیں اور چیزیں کتنی پیدا ہوئیں۔ ساری دنیا میں ترقی کو جی ڈی پی سے ناپا جاتا ہے۔ اس جی ڈی پی میں یہ نہیں گنا جاتا کہ اس ترقی کی قیمت کس نے ادا کی اور ماحول کو کیا نقصان ہوا؟ مثال کے طور پر ایئر پورٹ بنانے کو ترقی میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اسے بنانے میں کتنے لوگوں کے گاؤں اور کھیت تباہ ہوئے، کتنوں کا روزگار چھنا، اس کا اندازہ نہیں لگایا جاتا۔ جی ڈی پی میں یہ نہیں گنا جاتا کہ کون سے لوگ اس ترقی کی قیمت ادا کررہے ہیں۔ دوسرا شرح نمو پر زور دیا جارہا ہے۔ سرمایہ داری نظام کہتا ہے کہ جتنی فیکٹریاں، ایئرپورٹ اور ڈیم بنیں گے اتنی ہی شرح نمو بڑھے گی۔ جب تک ہم ان چیزوں کے خلاف کھڑے نہیں ہوں گے اور ماحول کو صاف کرنے کی کوششیں نہیں کریں گے، سماجی ناہمواریوں اور عدم برابری کو ختم نہیں کر پائیں گے۔ سرمایہ داری نظام کی حمایت کرنے والے کہتے ہیں کہ سب کچھ آزاد منڈی کو دے دیں یعنی ریاست پیچھے ہٹ جائے تو ہم ترقی کی طرف جائیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترقی آزاد معیشت منڈی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نجی ملکیت کو قوانین کے ذریعے پکا کردیا جائے تو لوگ خود ہی ماحول کو صاف رکھیں گے کیونکہ اگر وہ ماحول کو تباہ کریں گے تو خود انہی کی ملکیت کا نقصان ہوگا۔ یعنی منافع نجی ہوگیا پر نقصان سماجی ہوا جس کی قیمت ریاست ادا کرتی ہے کیونکہ منافع کارپوریشنز، کمپنیوں اور امیر طبقہ نے کمایا لیکن اس کی قیمت آپ سب ادا کرتے ہیں کیونکہ آپ کی ریاست ان کی مدد کرتی ہے۔

پہلی ریو کانفرنس اور ریو+20 کے درمیانی عرصے میں بہت زیادہ سائنسی تحقیقات ہوئیں جن سے پتہ چلا کہ ماحول تیزی سے تباہ ہورہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس تیزی سے ماحول تباہ ہورہا ہے اور قومی وسائل کا استحصال کیا جارہا ہے اس کے نتیجے میں ہماری آنے والی نسلوں کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا۔ یہ پائیدار ترقی نہیں ہے۔ سائنسی تحقیق پر سرمایہ داری نظام کے کرتا دھرتا تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کہنا غلط ہے کے ماحولیاتی بحران کی وجہ سے عدم برابری،

غربت اور خوراک کا عدم تحفظ بڑھ رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک کچھ عدم برابریاں نہ ہوں ترقی ممکن نہیں ہوتی۔ یعنی ماحول کو تباہ کیے بغیر ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کی مثال 1960 کی دہائی میں ملتی ہے جب پاکستان کی شرح نمو 6 سے 8 فیصد تھی۔ اس وقت اتنی عدم برابری ہوئی کے ایوب خان کے خلاف زبردست تحریک چل پڑی۔ اس دور میں بڑا طبقاتی فرق سامنے آیا۔

سرمایہ دار طبقہ کہتا ہے کہ سرمایہ داری نظام برقرار رہے گا لیکن ہم مزدور، کسان اور دانشور طبقہ کا خیال ہے کہ یہ سب اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہم اس نظام پر کوئی تنقید نہ کریں اور اس کو مان لیں۔ ہمارا ماننا یہ ہے کہ ترقی ایسی ہو جو منصفانہ اور پائیدار ہو جو یقیناً ممکن ہے۔ سرمایہ دار یہ تنقید بھی کرتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی چھپی ہوئی Protectionism ہے یعنی اس کا تصور یہ ہے کہ پہلے ریاستیں دوسرے ملکوں کی سستی مصنوعات پر اپنے دروازے بند کر دیتی تھیں تا کہ مقامی صنعت سے وابستہ لوگ مسائل کا شکار نہ ہوں۔ اب یہ قانون ختم کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ پائیدار ترقی تو Protectionism اور مقامی صنعت کو بچانے کا ایک ذریعہ ہے۔

دوسرے ملکوں کی مصنوعات کی آزاد تجارت سے کسی نہ کسی مزدور کا حق مارا جاتا ہے۔ آج کل جدید سرمایہ داری نظام کو ترقی کا ذریعہ سمجھا جا رہا ہے۔ یہ ہمیں سوچنا ہے کہ کیا ہمارا سرمایہ نجی ہو؟ کیا ریاست پیچھے ہٹ جائے اور سرمایہ داری کو کھلے طور پر استحصال کرنے دیا جائے؟ کیا آپ اور ہم جیسے لوگ زیادہ دیر تک اس نظام کو برداشت کر سکتے ہیں؟ یہ پائیدار ہے یا نہیں؟ یہ سوچنے کی بات ہے کہ پائیدار ترقی کیسے ممکن ہے؟ سرمایہ داری نظام ہمیں کس طرف لے جا رہا ہے اور آگے کیا ہوگا؟ ہمیں کن چیزوں کے خلاف تحریک چلانی ہے اور کس طرح ان کا تدارک ہوگا؟

پائیدار ترقی، ایک مفصل جائزہ

عذرا طلعت سعید

عذرا طلعت سعید نے پائیدار ترقی پر مفصل جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''جب لفظ سرمایہ داری کی بات کی جاتی ہے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ بنیادی طور پر پاکستان کسان مزدور تحریک کے اندر سرمایہ داری پر بحث و مباحثہ جاری رہتا ہے۔ میں مفصل بات شروع کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہوں گی کہ عوام کی نظر میں لفظ ترقی اور پائیدار ترقی کے کیا معنی ہیں۔

شرکاء کی رائے

ثمینہ ناز، گھوٹکی، سندھ:

ترقی اسے کہتے ہیں جو بہتری کی طرف قدم ہو یعنی اچھی تبدیلی ہو۔

میاں قصور، ملتان، پنجاب:

ہم مادی طور پر خوشحالی کو ترقی سمجھتے ہیں لیکن جب انسان ذہنی اور شعوری طور پر تبدیل ہوتا ہے تو ترقی ہوتی ہے۔

اسماعیل گورچانی، میرپور خاص، سندھ:

تعلیم اور روزگار کا ہونا ترقی ہے۔

اکرم ناصر، بہاولپور، پنجاب:

ایسی ترقی ہو جس سے عوام کے مسائل کا حل نکل کر آئے۔ مثلاً روزگار، تعلیم کا حصول۔

ڈاکٹر عذرا طلعت سعید نے کہا کہ ''جیسے کہ شرکاء نے کہا، ترقی کا لفظی معنی بہتر تبدیلی ہے۔ یہاں معاشی اور شعوری تبدیلی کی بھی بات کی گئی۔ شعوری تبدیلی دراصل سیاسی تبدیلی ہے۔ پاکستان کسان مزدور تحریک کے قومی رابطہ کار علی اکبر نے بھی اپنی خوش آمدیدی تقریر میں کہا کہ تبدیلی کے لیے سیاسی کارکن کا ہونا ضروری ہے۔ ترقی کے لیے چار ستونوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ستون ہماری کوششوں اور جدوجہد کو وزن دیتے ہیں۔ جس جگہ یہ عناصر موجود نہ ہوں ترقی نہیں ہوسکتی۔ سب سے زیادہ مضبوط ستون سیاسی ہے۔

1۔ معاشی 2۔ سماجی 3۔ سیاسی 4۔ ماحولیاتی

جب ہم اسکول تعمیر کرنے کی بات کرتے ہیں تو یہ سماجی ترقی ہے۔ جب بہتر روزگار کی بات کرتے ہیں تو یہ معاشی ترقی ہے۔ جب ہم شعور کی بات کرتے ہیں تو یہ سیاسی ترقی ہے۔ پائیدار ترقی وہ ہے جس میں وسائل خصوصاً قدرتی وسائل کا اس طرح استعمال کیا جائے کہ آج کی نسلیں بھی انہیں استعمال کریں اور کل آنے والی نسلوں کے لیے بھی وسائل محفوظ ہوں۔ میرے نزدیک وسائل صرف ماحول ہی نہیں ہمارے بچے بھی ہیں۔ ہم آج کے نوجوانوں کو کونسی سیاست سکھا رہے ہیں؟ ہمارا نوجوان صرف پیسے اور مادی چیزوں کے حصول کو ترقی سمجھتا ہے۔ اسی لیے آج کی کانفرنس پائیدار ترقی کے نام پر رکھی گئی ہے تاکہ ہم وضع کریں کہ پائیدار ترقی کیا ہے؟ ہم اپنے گھر میں دیکھیں کہ کیا گھر کے ارکان میں سیاسی شعور

ہے یا انہیں سماجی اور معاشی تحفظ حاصل ہے؟ ہر انسان کو سیاسی شعور کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہمیں اس شعور کو کس رخ پر ڈھالنا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے گھروں میں دادی، نانی، ہماری مائیں، بچیوں کو سکھاتی ہیں کہ لڑکیوں کو کم کھانا دو اور بھائیوں کو زیادہ دو، کیونکہ ہمارے گھر کا سیاسی شعور ہم سے یہ کہتا ہے کہ مرد زیادہ عقلمند ہے اور وسائل پر اس کا قبضہ ہے اور اگر عورت کو اس گھر میں رہنا ہے تو اسے سمجھنا ہے کہ گھر کے افراد اس کی طرف داری کرتے ہیں جو حاکم ہوتا ہے۔ اگر مجھے میرا حق نہیں ملتا اور میں اس کے خلاف آواز اٹھاؤں تو یہ بغاوت نہیں بلکہ حق کی سیاست ہے۔ پی کے ایم ٹی ہمیشہ سچ بات کہنے پر یقین رکھتی ہے۔ ہم کسان کو اپنے ملک کا اہم ترین جزو سمجھتے ہیں کیونکہ اگر کسان گندم اگانا چھوڑ دے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ پاکستانی عوام ایک وقت کی روٹی بھی کھا سکیں۔ پاکستان کسان مزدور تحریک کے پچھلے اجلاس سے ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک مزدور اور کسان سیاست کے حوالے سے سب سے زیادہ اہم طبقہ ہے۔ یہ نظریہ پی کے ایم ٹی کے سیاسی شعور کا شفاف رخ ہے۔ محمد صابر نے صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ ہم پائیدار زراعت کی طرف جارہے ہیں اور یہی ہمارا معاشی شعور ہے۔ یہ سوال بھی ہے کہ کیا ہمارا کسان اس وقت آزاد ہے یا کمپنیوں کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے؟ کیا ہم یہ مانتے ہیں کہ زیادہ یوریا اور ڈی اے پی سے ہم آگے جائیں گے یا یہ مانتے ہیں کہ اپنی فصلوں میں اصلی کھاد اور روائتی بیج ڈال کر ہم اپنے لیے بہتر غذا اگائیں گے؟ یہ فیصلہ کسان کو کرنا ہے کہ پائیدار زراعت کسان کی نظر میں کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اپنے معاش کو کس رخ پر لے جانا چاہتے ہیں؟ ایک بہت بڑا سوال پاکستان کے کسانوں کے لیے ہے کہ ہم کس طرف جارہے ہیں؟ اپنی معاش کا سوال کیسے حل کر سکتے ہیں؟ ہماری معاش کے سوال کے کون سے جزو ہیں جو ہمیں اپنانے ہیں؟ شعور کے بغیر لڑنا مشکل ہے۔ اس کانفرنس کا عنوان، جدوجہد اور فیصلہ سازی رکھا گیا ہے جو آئینہ دار ہے کہ سیاسی شعور کے بغیر کوئی جدوجہد نہیں ہوسکتی۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ ہم اپنے سماج کو بدلنے کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ یعنی جب ہم اپنے آپ کو پسے ہوئے طبقے کی آواز کے ساتھ جوڑتے ہیں اور خود کو تبدیلی کی جدوجہد میں شامل کر لیتے ہیں تو کیا ہم خود کو سماجی کارکن کہتے ہیں یا سیاسی کارکن؟ علی اکبر نے کھل کر کہا ہے کہ ہمیں سیاسی کارکن چاہئیں۔ اگر ہم سیاسی کارکن ہیں تو ہماری سوچ کیا ہے؟ اس کا راستہ کیا ہے؟ سیاسی کارکن یقیناً سماج میں طبقہ ورانہ بنیاد پر زیادتیوں کو للکارتا ہے۔

میرے خیال میں پائیدار ترقی چار ستونوں یعنی سیاسی، معاشی، سماجی اور ماحولیاتی ستونوں پر قائم ہے۔ پچھلے سال کانفرنس میں جو ساتھی شریک ہوئے انہیں یاد ہوگا کہ ہم نے ریو+20 کے حوالے سے بات کی تھی۔ اس کانفرنس کو جون 2012 میں منعقد کیا گیا۔ وہاں دو طرح کی حکومتیں تھیں، ایک پہلی دنیا کی سامراجی سرمایہ دار حکومتیں جو مزدور اور

قدرتی وسائل کے استحصال پر یقین رکھتی ہیں۔ دوسری طرف تیسری دنیا کے ممالک کی حکومتیں موجود تھی۔ اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ دنیا بھر کی ریاستیں اور عوامی گروہ آنے والے سالوں کے لیے سوچیں گے کہ پائیدار ترقی کیا ہے لیکن جب حکومتی سطح پر یہ سوال اٹھایا جائے کہ پائیدار ترقی کیا ہے اور اس میں سامراج خود بیٹھا ہو تو سب جانتے ہیں کہ جواب کیا آئے گا۔ ہمیں پتہ ہے کہ ہمارے ملکوں سے سامراجی حکومتوں کو بھوک کا شکار، سستا اور غریب مزدور چاہئے۔ جب سامراج فیصلہ کرے گا کہ پائیدار ترقی کیا ہے تو وہ آزاد تجارت، مزدوروں اور ماحول کے استحصال کی طرف جائے گا۔ ہماری حکومتیں کون ہیں؟ کیا یہ سامراج کے اثر سے آزاد ہیں یا عام الفاظ میں ان کو لوٹا حکومتیں بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ حکومتیں ہیں جو صرف سامراج کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ جو خدمت ہم نے شاید برطانوی راج میں نہیں کی وہ آج کی آزاد حکومتیں کررہی ہیں۔ ریو+20 کی کانفرس میں ہماری تیسری دنیا کی حکومتیں بھی موجود تھیں اور بار بار غریب عوام کو غربت کا شکار بنوانے پر تلی ہوئی تھیں۔ عوام کی غربت کو ڈھال بنا کر سرمایہ دار حکومتوں سے مذاکرات میں مول تول ہورہا تھا۔ سام راج کے بہت سے استحصالی فیصلوں کو تیسری دنیا کی حکومتیں بار بار رد کررہی تھیں۔ لیکن افسوس کہ جب ہمارے اعلیٰ افسر وطن واپس آتے ہیں تو اوپری دکھلاوے کی مزاحمت ایک طرف کردی جاتی ہے۔ جب یہ حکمران وہاں سے واپس آتے ہیں تو سب باتیں پانی ہوجاتی ہیں اور یہاں ترقی کے نام پر بڑے بڑے ائیرپورٹ، ہائی ویز اور عمارتیں بن جاتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کانفرنس کے بعد ہمارا کردار کیا ہے؟ اسی لیے عوام کو یہ جگہ دی گئی ہے کہ وہ بتائیں کے پائیدار ترقی کیا ہے؟ ہم جیسے لوگوں کا خیال ہے کہ جب تک عوام نہیں سوچیں گے اسے بیان نہیں کرسکیں گے۔ مزدور کسان کے لیے یہ بہت اہم ہے کہ وہ اپنے لیے فیصلہ کریں کہ معاشی، ماحولیاتی، سماجی اور سیاسی حوالے سے پائیدار ترقی کیا ہے تاکہ ہم اپنی حکومت کو یہ بتاسکیں کہ پاکستان کے مزدور کسان ترقی کس کو کہتے ہیں۔

علی اکبر نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ پاکستان میں کسان نمائندہ کئی تنظیمیں کھل گئی ہیں۔ لوگوں کے نام پر پیسہ دے کر انہیں استعمال کرنا این جی اوز کا خاص کام ہے۔ یہ کسانوں کا امتحان ہے کہ ہم سے سوال کریں کہ ہم دوسری تنظیمیں سے کیسے مختلف ہیں؟ کس بات پر ہم کہتے ہیں کے ہم چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے حمایتی ہیں؟ ہمیں اپنے موقف کو بالکل واضح کرنے کی ضرورت ہے ورنہ مزدور کسان کے استحصال کا ایک نیا راستہ شروع ہو جائے گا۔

سیاست میں عالمی اور عوامی سطح پر تین طرح کے رنگ نمایاں ہیں:

- پہلا وہ سیاسی گروہ ہے جو آزاد تجارت اور سرمایہ داری کو درست مانتا ہے۔

- دوسرا سیاسی گروہ اصلاح پسندی پر مبنی ہے۔ یہ سرمایہ داری کو مانتے ہیں پر کہتے ہیں کہ اس پر تھوڑی سی روک ٹوک لگادی جائے ۔یعنی موجودہ نظام میں آپ تھوڑی بہت اونچ نیچ کر دیں تو اس سے عوام خوش حال ہوسکتے ہیں۔
- تیسرا سیاسی گروہ خود انحصاری ،خود کفالت کی سوچ کو اپناتا ہے، موجودہ نظام جو سرمایہ دارانہ پیداواری نظام پر کھڑا ہوا ہے، پرسخت تنقید کرتا ہے اور اس میں عوام کی فلاح کا کوئی راستہ نہیں دیکھتا۔ اس کو ہم خود انحصاری یا انقلابی سوچ کہتے ہیں۔ اس زاویہ، اس نظریہ کے لوگ اس یقین کے ساتھ کھڑے ہیں کہ ہم موجودہ نظام کے ساتھ آگے نہیں جاسکتے۔ اب ہمیں نظام کی تبدیلی ہی چاہئے۔ اس گروہ کے لیے پائیدار ترقی نظام کی تبدیلی پر مبنی ہے۔

سوال یہ ہے کے پاکستان کسان مزدور تحریک ان تین سیاسی زاویوں میں سے کس کے ساتھ کھڑی ہے؟ پائیدار ترقی کے حوالے سے آپ کی سیاسی سوچ آپ کو راستہ دکھائے گی۔ آپ کو باقی اداروں سے جوڑے گی یا مختلف بنا کر آپ کو ان سے الگ کردے گی۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اپنا حق کن بنیادوں پر لینا چاہتے ہیں ۔اگر ہمارا نوجوان طبقہ جدوجہد میں شامل ہوجائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں اس ملک کی زمین اور عوام کا تحفظ کرسکتی ہیں۔ ہم جو خود کو پی کے ایم ٹی کے ساتھ جوڑتے ہیں، معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کے افراد سے جوڑتے ہیں، اگر ہم سیاسی کارکن ہیں تو ہماری سوچ کونسی ہے؟ ہمارا راستہ کون سا ہے؟ ہم جیسے لوگوں کا ماننا ہے کہ پائیدار ترقی ممکن ہے لیکن اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے، جسے ہم جدوجہد کہتے ہیں۔ منظّم سیاسی شعور کے ساتھ جدوجہد ضرور رنگ لائے گی جس کے ذریعہ مزدور کسان کے لیے ایک بہتر حال اور بہتر مستقبل ممکن ہوگا۔

کانفرنس میں شرکاء کے چند اہم سوالات و جوابات اور آراء

علی نواز جلبانی،گھوٹکی،سندھ:

سوال: 1992 میں ریوسمٹ کے اجلاس میں Polluters Pays کا اصول طے ہوا تھا۔ ماحول آلودہ کرنے والے ممالک سے 20 سال بعد ریو+20 کے اجلاس میں اس بارے میں سوال کیا گیا ؟

ڈاکٹر روبینہ سہگل: اس اصول کے باوجود ترقی یافتہ ممالک ماحول آلودہ کرنے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں لیکن

وہ اس سے مسلسل انکار کرتے رہے ہیں۔ اس آلودگی کی قیمت عوام ادا کر رہے ہیں کیونکہ عوام کے پیسے سے ماحول کو صاف کرنے کی ترکیبیں آرہی ہیں، فائدہ امیر ممالک اوران کی کمپنیوں کو جارہا ہے۔ ڈاکٹر عذرا صاحبہ نے اس اجلاس میں شرکت کی تھی اس لیے وہ بہتر جواب دے سکتی ہیں کہ وہاں ان ممالک سے سوال کیا گیا یا نہیں۔

ڈاکٹر عذرا طلعت سعید: وہاں ایسا لگ رہا تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک سے زیادہ کوئی انقلابی حکومتیں نہیں ہیں۔ ہر وہ سوال جو عوام اٹھاتے ہیں، ہماری حکومتیں وہاں اٹھارہی تھیں۔ لیکن ہمارا وہی حکمران طبقہ جب واپس آتا ہے تو عوام کے ساتھ پہلی دنیا کے ممالک والا سلوک کرتا ہے۔ آج جتنی بھی پالیسیاں ہم پر لاگو کی جارہی ہیں انہیں پہلی دنیا کے ممالک رائج نہیں کرتے، یہ ہماری حکومتیں ہیں جو ہم پر یہ پالیسیاں لاگو کرتی ہیں۔ سوال تو وہ لوگ اٹھا رہے تھے لیکن جب سامراجی حکومتوں کے ساتھ مل کر ان کی بتائی ہوئی پالیسیوں کو عوام پر لاگو کردیا جائے تو سوال بے معنی ہوجاتے ہیں۔

انور علی چاچڑ، گھوٹکی، سندھ:

سوال: ریو+20 کے اجلاس کی آزاد ادارے کی حیثیت ہے یا یہ ادراہ بھی امریکہ کے زیر اثر کام کرتا ہے؟

جواب: عموماً اس قسم کے سربراہی اجلاس اقوام متحدہ کے تحت ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے 190 کے قریب ارکان ہیں۔ اس میں تقریباً پوری دنیا کے ممالک شامل ہیں۔ پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اقوام متحدہ کیا ہے؟ میرے ذاتی نظریہ کے مطابق اقوام متحدہ عالمی سرمایہ داری نظام کا ایک جزو ہے جیسے عالمی تجارتی ادارہ یا عالمی مالیاتی ادارہ ہے۔ یہ سرمایہ داری نظام کے براہ راست پیروکار ہیں کیونکہ ان کے ذریعے پالیسیاں بنائی جاتی ہے جو سرمایہ داری نظام کی نئی شکل کو آگے بڑھاتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے قائم ہونے کے مقاصد تو مختلف تھے کہ امن قائم ہو، عوام کے حقوق محفوظ ہوں لیکن اگر دیکھا جائے تو اقوام متحدہ کے ڈھانچے کے اندر ہی عدم برابریاں ہیں مثلاً پانچ ملک تمام دنیا کے ووٹوں کو ویٹو (مسترد) کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ادارہ بنیادی طور پر سرمایہ داری نظام کا بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ یہ اس نظام کو اچھا اور خوبصورت پیش کرنے کے کام آتا ہے۔ اقوام متحدہ، عالمی تجارتی ادرے اور مالیاتی ادارے کے دیے گئے زخموں پر مرہم لگانے کا کام کرتا ہے۔ اقوام متحدہ تین سیاسی نظریوں سرمایہ داری، اصلاح پسندی اور خود انحصاری میں سے اصلاح پسندی کو جان بوجھ کر فروغ دیتا ہے۔

حاکم گل، شکارپور، سندھ:

سوال: ریو+20 کی سربراہی کانفرنس میں حکومتی نمائندگان کے علاوہ سول سوسائٹی کا کیا موقف تھا اور چونکہ عذرا صاحبہ نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی تو آپ کا وہاں کیا کردار رہا اور اس کو وہاں کیسے دیکھا گیا؟

جواب: سربراہی اجلاس 1992 اور پھر 2012 میں ماحولیات کے حوالے سے منعقد کیے گئے تھے۔ ان میں سماجی کارکنان کے لیے 9 گروپ تشکیل دیے گئے تھے:

i۔ مزدور/ٹریڈ یونین ii۔ کسان iii۔ عورتیں iv۔ نوجوان/بچے v۔ مقامی لوگ
vi۔ بزنس کمیونٹی vii۔ سائینٹفک کمیونٹی viii۔ این جی اوز ix۔ مقامی حکومتیں

یہ نو گروہ حکومتی کاروائی کے دوران وہاں بیٹھ سکتے تھے۔ حکومت کے لوگ آپس میں بحث ومباحثہ کرتے تھے کہ ان کی نظر میں پائیدار ترقی کیا ہے۔ ہر حکومتی نمائندے کی الگ کرسی تھی اور وہ بول سکتا تھا۔ سول سوسائٹی کے کارکنان پیچھے کمرے میں بیٹھ کر صرف سن سکتے تھے بول نہیں سکتے تھے۔ ریو+20 میں وقتاً فوقتاً چار دفعہ دو دو ہفتے کی میٹنگ ہوئیں جن میں ہر گروہ کو موقع دیا گیا کہ وہ صرف دو منٹ کے لیے اپنا موقف بیان کریں۔ یہ جو تین سیاسی رنگ (سرمایہ داری کے حامی اصلاح پسند، انقلابی/خود انحصاری) میں نے آپ کو بتائے یہ سول سوسائٹی کے ہر گروہ میں موجود تھے، سول سوسائٹی چاہے وہ عورتوں کا گروہ ہو کسانوں کا ہو یا نوجوانوں کا۔ ہر گروہ میں تینوں سیاسی رنگ کے لوگ موجود تھے۔ چونکہ یہ طبقاتی کشمکش ہے اس لیے یہ جدوجہد کا ایک اور محاذ ہے جس میں حصہ لینا ضروری ہے۔ گروہ اپنی اپنی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ جب سول سوسائٹی بولے تو کس کی آواز بھاری ہو، اصلاح پسندی کی، خود انحصاری کی یا آزاد تجارت کی۔

پائیدار ترقی اور عورتوں کے مسائل

لوک تماشہ: ''عورت''

پاکستان میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے سوجھلا تھیٹر ٹیم کی طرف سے ''عورت'' کے نام سے ایک ڈرامہ پیش کیا گیا جس میں وڈیرہ شاہی اور پدر شاہی نظام کی عکاسی کی گئی کہ کس طرح ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ عورتوں کو فیصلہ سازی کی اجازت نہیں اور نہ ہی اپنی شناخت کی اجازت ہے۔ ان کو تعلیم اور فیصلہ سازی جیسے بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ عورت چاہے کسی غریب گھر کی ہو یا امیر خاندان کی فرد، وہ استحصالی اور ظالمانہ رویوں کا سامنا کرتی ہے۔ نہ صرف عزت اور غیرت کے نام پر عورتوں کا استحصال کیا جاتا ہے بلکہ عزت اور غیرت کے نام پر عورتوں کے چہروں پر تیزاب بھی پھینکا جاتا ہے۔ اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنا کر ان کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں ان عورتوں کو قانونی چارہ جوئی کے حق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ لوک تماشہ میں معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں بالخصوص عورتوں اور چھوٹے کسانوں کے ساتھ جاگیرداروں کے ظلم اور اس کے خلاف چھوٹے کسانوں کو کھڑا ہوتے دکھایا گیا۔ لوک تماشہ میں دکھایا گیا کہ اگر عورت تعلیم حاصل کر لے گی تو مردوں کے مقابل آ کھڑی ہوگی۔ اس طرح وہ پدر شاہی نظام کے ساتھ ساتھ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی مخالفت بھی کر سکے گی۔

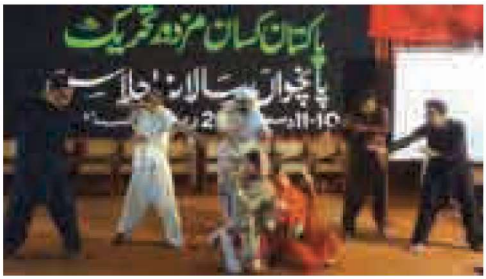

پدرشاہی نظام اور عورتوں کے حقوق

سونی

پدرشاہی نظام کے بوجھ تلے پسی ہوئی عورتوں کے حقوق کے بارے میں ٹنڈو محمد خان سے تعلق رکھنے والی پی کے ایم ٹی کی ممبر سونی بھیل نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم عورتیں مردوں کے بنائے ہوئے پدرشاہی نظام میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ایک عورت ہونے کے ناطے اپنے فیصلے خود کرنا تو دور کی بات ہمیں بولنے تک کی آزادی میسر نہیں۔ ہم ان پڑھ ہیں اس لیے اس نظام کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔ پہلے مائیں بچیوں پر کنٹرول کرتی ہیں کیونکہ وہ بھی اس نظام کا حصہ بن چکی ہیں، پھر باپ اور بھائی۔ بیٹی کی پرورش تعلیم اور غذا وغیرہ کا اتنا خیال نہیں رکھا جاتا جتنا لڑکوں کا رکھا جاتا ہے۔ جب وہ لڑکی شادی ہوکر دوسرے گھر جاتی ہے تو وہ شوہر کے کنٹرول میں آجاتی ہے۔

مرد کام کرکے آتے ہیں اور گھر میں چارپائی پر بیٹھ کر عورت پر حکم چلاتے ہیں۔ عورت بھی بنی (کھیت) پر اتنا ہی کام کرتی ہے جتنا مرد کام کرتا ہے، پھر اسے اجرت کم کیوں دی جاتی ہے؟ پھر اس اجرت پر بھی مرد کا قبضہ ہوتا ہے۔ یہ سب پدرشاہی نظام کی وجہ سے ہے کیونکہ اس میں عورتوں کے حقوق کو دبا دیا گیا ہے۔ تمام بھائیوں بہنوں سے گزارش ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر سمجھیں۔ عورت کے حق کو برابر سمجھیں، اسے تعلیم دلائیں، فیصلہ سازی میں اس کی شمولیت یقینی بنائیں۔ یہ ابتداء ہمیں اپنے گھروں سے کرنی ہے تب ہی ہم عورتوں کے حقوق کی جدوجہد میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام اور عورتوں کے مسائل

ثمینہ جعفری

سرمایہ داری نظام میں عورتوں کے حقوق اور ان کے استحصال پر خیالات کا اظہار کرتے ہیں ہوئے ثمینہ جعفری نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار کے چکر میں ہمارا معاشرہ چل رہا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ پسنے والی ہستی عورت ہے۔ تمام کسان اس بات کو درست مانیں گے کہ مردوں کی نسبت عورتیں کھیتوں میں زیادہ کام کرتی ہیں۔ ہم نے خود ہی ایک معیار بنالیا ہے کہ مشقت والا کام عورتوں کے حصے میں آئے گا اور خرید و فروخت کا کام مرد کریں گے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو اس کا کوئی تجربہ نہیں۔ کسی حد تک یہ بات درست ہے کہ عورتوں کے لیے مارکیٹ جانا مشکل ہے۔ لیکن یہ کہاں لکھا ہے کے کپاس کی چنائی کا کام صرف عورتوں نے کرنا ہے۔ میں اس وقت پنجاب کی نمائندگی کر رہی ہوں، وہاں زیادہ تر کپاس کی کاشت کی جاتی ہے اور نقد آور فصلوں کا رجحان ہوچکا ہے۔ ہم غذائی خود مختاری سے نکل

کرصرف پیسہ کمانے کے چکروں میں پڑگئے ہیں۔ میرا دو ماہ پہلے کپاس کی چنائی کرنے والی عورتوں کے ساتھ کافی کام رہا۔ جس کپاس کی وہ چنائی کر رہی ہیں اس میں لاتعداد زہر آلود ادویات کا استعمال کیا جارہا ہے جس کے باعث وہ جن بیماریوں کا شکار ہورہی ہیں ان کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس اذیت کا مجھے اس وقت اندازہ ہوا جب میں دو منٹ کے لیے ان عورتوں کے پاس بیٹھ کر بات کی تو مجھے ان کے جسم پر بھی کیڑے نظر آتے ہیں۔ کپاس کی چنائی کے بعد گھر کی ذمہ داری اور جانوروں کو سنبھالنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ زمیندار کی فصل پر کام کرنے سے انکار کی صورت میں انھیں دھمکی ملتی ہے کہ جانوروں کا چارہ نہیں دیا جائے گا۔

تبدیلی ہمیں خود لاتی ہے۔ جب تک ہم خود تبدیل نہیں ہوں گے، معاشرہ یا نظام تبدیل نہیں ہوگا۔ ہمیں اس سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کی کوشش کرنی ہے۔ عورتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے مردوں کو ان کا ساتھ دینا ہے۔

عورت اور جاگیرداری نظام

ثمینہ ناز

محترمہ ثمینہ ناز نے ''عورت اور جاگیر داری نظام'' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لفظ جاگیر سے ہمارے ذہن میں ایک ایسے علاقے کا تصور آتا ہے جہاں کنٹرول ایک آدمی کا ہو، جہاں اس کی فصلیں، باغات، گاؤں ہو اور وہ اس کا مالک ہوتو ہم اس کو جاگیر دار کہتے ہیں۔ اس گاؤں میں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن کے لئے جاگیردار نظام بناتا ہے جو ان لوگوں کے نہیں بلکہ جاگیر دار کے مفاد میں ہوتا ہے۔ اس جاگیر میں رہنے والے مالی طور پر مستحکم نہیں ہوتے۔ جب انہیں کسی مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ جاگیردار کے پاس جاتے ہیں۔ جاگیردار ان سے پوچھتا ہے کہ ان کے خاندان میں کتنی عورتیں ہیں۔ اگر عورتیں زیادہ ہوں تو وہ انہیں زیادہ قرضہ دیتا ہے اور قرضہ کی واپسی تک عورتوں سے اپنی زمینوں پر کام کرواتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت کم اجرت پر زیادہ وقت کے لیے عورتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جب لوگ مدد کے لیے بار بار جاتے ہیں تو وہاں کا جاگیردار مضبوط ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کا کرتا دھرتا میں ہی ہوں۔

ہمارے گھر کے اندر بھی ایک جاگیرداری نظام موجود ہوتا ہے۔ گھر کا سربراہ گھر کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ ہماری سوچیں اور باتیں گھر کے اندر گھر کے سربراہ کی اور گاؤں کے اندر جاگیر دار کی غلام بن جاتی ہیں۔ ان سے پوچھے اور اجازت لیے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ نظام عورت پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہیں کر

سکتی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہماری سوچ ابھی تک آزاد کیوں نہیں ہے۔ ہم جاگیرادری نظام میں اب تک کیوں پس رہے ہیں؟ ہم ترقی کیوں نہیں کر سکتے؟ دراصل جب تک ہماری سوچیں غلام ہیں ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

جاگیرداری نظام میں عورتیں بہت زیادہ محنت کر رہی ہیں پر وہ ترقی نہیں کر پا رہیں کیونکہ جاگیر دار کبھی نہیں چاہے گا کہ عورتیں پڑھ لکھ کر ترقی کریں، ان میں شعور اور آگاہی آئے اور وہ اپنے حقوق کی بات کریں۔ اگر ایسا ہو گیا تو جاگیردار کی زمین پر کام کون کرے گا کیونکہ عورتیں فصلوں پر زیادہ کام کرتی ہیں۔ شہروں کی نسبت گاؤں میں لڑکیوں کے اسکول برائے نام نظر آئیں گے۔ اپنی تقدیر بدلنے کے لیے آواز بلند کرنا پڑے گی اور اپنے حقوق حاصل کرنے پڑیں گے۔

عورتوں کے حقوق: جدوجہد اور تدابیر

علی اکبر

میرے لیے دکھ کی بات ہے کہ آج میرے ساتھ خیبر پختونخواہ سے کوئی عورت نمائندگی نہیں کر رہی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں صورت حال کتنی ابتر ہے، حالانکہ پہلے صورت حال ایسی نہیں تھی۔ جدوجہد کے حوالے سے دیکھا جائے تو آزادی کی تحریک میں، خدائی خدمت گار تحریک میں عورتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہیں۔ ضیاء الحق کے دور سے پہلے عورتیں سیاست اور سماجی کاموں میں بھرپور حصہ لیتی تھیں جیسے سندھیانی تحریک اور ہشت نگر کی کسان تحریکوں میں عورتوں نے بھرپور حصہ لیا۔ حالیہ دور میں اوکاڑہ کی تحریک میں بھی عورتوں کا اہم کردار ہے۔ مگر اب ہمارے یہاں عورتوں کے لیے صحت کے شعبے کے علاوہ ملازمت کی کہیں گنجائش نہیں رہی۔ ہمارے یہاں عورتیں گھروں میں پردے کے نام پر بند کر دی گئی ہیں کیونکہ پدر شاہی نظام ہر مرد کے اندر گھسا ہوا ہے۔ ضیاء الحق کے بعد جب مشرف کا دور آیا اور لبرل ازم کا فروغ ہوا تو لوگوں کو محسوس ہوا کہ شاید کوئی تبدیلی آ سکے لیکن اس کے ردعمل میں طالبان نے دیر اور سوات میں کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں کو بھی گھر بیٹھا دیا۔

ہمیں اپنے قول و فعل کے تضاد کو ختم کرتے ہوئے تبدیلی کی ابتداء اپنے گھر سے شروع کر دینی چاہئے کیونکہ باہر مذہب کے نام پر عورتوں کو پابندیوں میں جکڑا جاتا ہے۔ جدوجہد رویوں کا نام بھی ہے۔ اس پر غور کرنا ہے کہ ہم اپنے رویوں میں کیسے تبدیلی لاتے ہیں کیونکہ ہمارے بعض علاقوں میں جاگیردار نہیں رہے لیکن ان کی باقیات ابھی تک اتنی مضبوط ہیں کہ عورتوں کے حقوق پر اثر ڈالتی ہیں جس سے انہیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہاں پر سرمایہ داری

اورجاگیر داری نظام بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس پدر شاہی نظام کو چھپا کر رکھتا ہے۔ہمیں سیاسی طور پر عورتوں کو شعور و آگاہی دینی ہے ۔ہمیں اپنے گھروں میں جاگیرداری کی باقیات کو ختم کرتے ہوئے رویوں کو بدلنا ہوگا تب ہی حالات بہتر ہونگے۔

پائیدار ترقی اور عورتوں کے مسائل

نیلم حسین

محترمہ نیلم حسین نے پائیدار ترقی اور عورتوں کے مسائل پر بات کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ایک نعرہ لگایا جارہا ہے کہ جو بوئے گا وہی کھائے گا،اس نعرہ سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں تو پھر جو عورت بچے پیدا کرتی ہے، انہیں بولنا سکھاتی ہے، پرورش کرتی ہے،فصلوں میں کام کرتی ہے، اسے اپنی زندگی پر اختیار کیوں نہیں ہے؟ جب کوئی عورت اپنی آواز اٹھاتی ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ اس پر پابندی لگادی جاتی ہے تاکہ اس کی آواز باہر نہ نکلے، وہ گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہ نکال سکے۔ یہ ظلم اور استحصال نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم بات پائیدار ترقی اور عورت کی کرتے ہیں لیکن ہماری بنیاد کمزور رسموں پر ہے۔ جس گھر میں عورت کو پیدا ہوتے ہی احساس دلایا جائے کہ وہ کم تر ہے اور وہ ساری زندگی اس خوف کے ساتھ پلتی رہے اور اس کی سوچ پر مردوں کی پابندی ہو تو وہ کس طرح اپنے حقوق کی آواز بلند کرے گی؟ کانفرنس میں آکر اچھی باتیں کرنا آسان ہے پر ان مسائل کے حل کے لیے اپنی زندگی کو بدلنا ہوتا ہے، سوچ بدلنی ہوتی ہے۔ جیسے ڈاکٹر عذرا نے بتایا کہ اقوام متحدہ میں امیر ممالک کی آواز حاوی ہوتی ہے اور تیسری دنیا کے عوام کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے، اسی طرح پدر شاہی نظام میں عورت کی آواز دبا دی جاتی ہے۔عوام کو ہی نہیں عورتوں کو بھی اپنی آواز اٹھانی پڑے گی۔ جس طرح امیر کو غریب کے مسائل کا علم نہیں ہوتا اسی طرح مردوں کو بھی علم نہیں کہ عورتوں کی تکالیف کیا ہیں، عورتوں کو خود پہل کرنی پڑے گی۔ جیسے عذرا نے سیاسی شعور کی بات کی تو میرے خیال میں اپنی ذات سے سیاست نکلتی ہے۔عورتوں کو انتخابات میں حصہ لینا چاہئے، شناختی کارڈ بنوانا چاہئے، یونین کونسل کے انتخابات میں حصہ لینا چاہئے، کیونکہ عورتیں اپنی آواز اٹھائیں گی تو آگے نکلیں گی۔شعور انسان اپنے تجربہ کی بنیاد پر حاصل کرتا ہے۔

ایک بڑا مسئلہ عورتوں کی زندگی اور خاندان میں مردوں کی عزت کے حوالے سے دیکھنے میں آتا ہے۔ میرے خیال میں مرد کی عزت عورت کے فائدے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں ہم قصور کے ایک گاؤں میں تحقیق کررہے تھے جو چھانگا مانگا جنگل کے قریب ہے۔تحقیق کے دوران پتہ چلا کہ وہاں دہاڑی پر کام کرنے والے مزدوروں کی بیویاں

جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتی ہیں تا کہ ان کے گھروں کے چولہے جل سکیں، مگر یہ ایندھن انہیں مفت میں نہیں ملتا بلکہ اس کے لیے انہیں وہاں فاریسٹ گارڈز اور رینجرز وغیرہ کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ اس بات کا علم گاؤں کے سب لوگوں کو ہے اور ان کے شوہروں کو بھی۔ شوہر انہیں طعنہ دیتے ہیں لیکن ان کی روٹی بھی کھاتے ہیں۔ مردوں کی عزت بھی قائم ہے اور کوئی بولتا بھی نہیں۔ اسی گاؤں میں کوئی لڑکی اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہے یا پوچھے بغیر گھر سے باہر نکل آئے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے تو میرے بھائیو عزت لفظوں کا کھیل ہے۔ عزت کے نام پر عورتوں کی زندگی سے کھیلنا مکاری ہے۔

کانفرنس میں شرکاء کے چند اہم سوالات و جوابات اور آراء

محمد شریف، گھوٹکی، سندھ:

سوال: پچھلے سالانہ اجلاس میں عورتوں کی نمائندگی زیادہ تھی لیکن اس بار صرف سندھ سے عورتوں کی نمائندگی زیادہ ہے، پنجاب سے عورتوں کی نمائندگی کم ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: علی اکبر نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جیسے میں نے اپنی صبح کی تقریر میں کہا تھا کہ جب تک ہم سیاسی سرگرمیوں کی طرف نہیں جائیں گے، کامیابی نہیں ملے گی۔ سندھ سے بہت سی عورتیں کانفرنس میں شرکت کے لیے

آتی تھیں پر ان کو گھر کے مردوں کی طرف سے پابندیوں کا سامنا کر نا پڑا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک مردوں کی حکمرانی ہے۔ جب تک گھر کی عورتوں کو مواقع نہیں دیں گے، ایسا ہوتا رہے گا۔ آپ کا کہنا درست ہے کہ عورتوں کی نمائندگی کم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے مشترکہ شعور و آگاہی کے پروگرام منعقد کرائے جائیں تاکہ عورتوں کو پابندیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شاہین مہر، گھوٹکی، سندھ:

سندھ میں جاگیرداری نظام بہت مضبوط ہے ۔ جہاں کہیں زمین کا مسئلہ ہوتا ہے، عورت کو ہی شکار بنایا جاتا ہے اور اسے کاری قرار دے کر زمین مانگنے کے نام پر کھیلا جاتا ہے۔ اس وقت ہمیں اپنے حق کے لیے لڑنے کی ضرورت ہے۔

محمد یعقوب، خیر پور، سندھ:

جب تک ہم اپنے اندر کے جانور کو نہیں ماریں گے، عورتوں کو آزادی نہیں دیں گے۔

زمین پر قبضہ اور زمینی اصلاحات

زمین پر اجارہ داری اور کسان پر اثرات

سہت

زمین پر اجارہ داری اور چھوٹے کسانوں پر اس کے اثرات پر ٹنڈو محمد خان سے پی کے ایم ٹی کی ممبر صحت کا کہنا تھا کہ ہم بے زمین ہاری ہیں، ہمارے پاس فصل اگانے کے لئے کھیت تو دور کی بات گھر بنانے کے لیے بھی زمین موجود نہیں ہے۔ پہلے زمینوں پر کاشت روایتی طریقوں سے کی جاتی تھی۔ مشینی زراعت آنے کے بعد بھی مرد اور عورتوں کو اتنی ہی محنت کرنا پڑتی ہے۔ سیلاب کے بعد سے ہمارے معاشی حالات بہت خراب ہوگئے ہیں۔ جن زمینوں پر ہم کام کرتے تھے وہ سیلاب کے باعث تباہ ہوگئیں۔ سیلاب کے بعد وڈیرے نے زمینیں دوسرے لوگوں کو ٹھیکے پر دے دیں۔ باہر سے لوگ آکر زمینوں پر کام کررہے ہیں اور ہم دوسری جگہوں پر کام کر کے گزارہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح جب غیر ملکی آکر ہماری زمینیں خریدیں گے اور ان پر فیکٹریاں لگائیں گے تو جو لوگ ان زمینوں پر محنت کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں وہ گزارہ کیسے کریں گے؟ ہم لوگ تعلیم یافتہ نہیں ہیں، ہمارا گزر بسر کھیتی باڑی سے ہی ہوتا ہے۔ مرد تو باہر جا کر مزدوری کرتے ہیں پر عورتیں جو گاؤں میں ہی محنت کرتی ہیں وہ کہاں جائیں گی؟ زمین ہاریوں کا قانونی حق ہے انہیں ہی ملنا چاہئے کیونکہ زمینوں پر محنت صرف ہاری کرتا ہے یا اس کے بچے۔ ہمیں اپنے حق کے لیے مل کر آواز بلند کرنی ہوگی۔

زمین پر اجارہ داری کے خلاف جدوجہد کا تاریخی پس منظر

طارق حسین

آج کے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا شکار عوام میں ایک نعرہ سننے کو ملتا ہے کہ ''جو بوئے، وہ کھائے''۔ بظاہر یہ چند الفاظ یا چھوٹا سا جملہ ہے، مگر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چند الفاظ اپنے اندر ایک الگ دنیا اور نظام معیشت لیے ہوئے ہیں۔ سندھ کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ نعرہ ایک طویل تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نعرہ سندھ میں غریب کسان کے استحصال کے خلاف پہلی آواز تھی جو آج سے 300 سال پہلے عظیم صوفی شاعر اور سماجی فلسفی صوفی شاہ عنایت شہید نے

اٹھائی۔ یہ وہ دور تھا جب سندھ میں جاگیرداری نظام اپنے عروج پر تھا اور سندھ خاص طور پر ٹھٹھہ کے کسان معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ اس وقت شاہ عنایت نے، جنھیں آج کے تاریخ دان اور محقق سندھ کا سوشلسٹ صوفی بھی کہتے ہیں، کسانوں کی خستہ حالی دیکھتے ہوئے جاگیردار اور حکمران طبقے کی طرف سے ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ انھوں نے سندھ کے کسانوں میں شعور بیدار کیا کہ وہ جس زمین پر کام کرتے ہیں، جس پر بیج بوتے ہیں، فصل اگاتے ہیں، ہل چلاتے ہیں اور دن رات مشقت کرتے ہیں، اس زمین پر اس کی پیداوار پر ان کا حق ہے۔ کسانوں کے حقوق کے لیے شاہ عنایت نے زمینداروں کے خلاف آواز بلند کی جو کہ اس وقت کی استحصالی قوتوں کے مددگار تھے۔ شاہ عنایت کو اگر وقت سے آگے کا مفکر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ انھوں نے اس معاشی نظام کی بات کی جسے دنیا نے دو صدیوں کے بعد انقلاب فرانس میں دیکھا اور جو کارل مارکس کی فکر میں نمایاں نظر آتا ہے۔

صوفیائے کرام کے حوالے سے ایک عام رائے پائی جاتی ہے کہ انھوں نے روحانیت، تزکیہ نفس اور خدا سے لو لگانے کی تلقین کی اور معاشرے کی استحصالی قوتوں کو چیلنج نہیں کیا مگر شاہ عنایت نے ظلم و جبر اور استحصالی نظام پر صبر کی تلقین نہیں کی بلکہ اس نظام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور کسانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان قربان کردی۔ ان کا تعلق ٹھٹھہ کے ایک علمی خانوادہ سے تھا۔ وہ 17 ویں صدی عیسویں میں مغل حکمران اورنگ زیب کے ہم عصر تھے جب سندھ مغل سلطنت کا صوبہ تھا۔ صوفی شاہ عنایت کی زندگی کا بڑا حصہ حصول تعلیم میں گزرا جس کے لیے انھوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں کے طویل سفر کیے۔ تقریباً 52 سال کی عمر میں حیدرآباد سے واپس ٹھٹھہ آئے جہاں لوگوں نے آپ کے ہاتھ سے بیعت کی۔ صوفی شاہ عنایت کے دور میں ٹھٹھہ کے کسان معاشی بدحالی کا شکار تھے جس کی بڑی وجہ مرکز کی طرف سے مختلف محصولات تھے۔ ان محصولات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''سندھ خاموشی کی آواز'' میں لکھتے ہیں کہ مغل حکومت کی جانب سے کئی قسم کے محصولات مقرر کیے گئے تھے جو تاجروں، کسانوں اور عوام کو دینا پڑتے تھے۔ ان میں سے خاص خاص یہ تھے:

1۔ دھرت: یہ اناج، تیل، روئی پر لگایا گیا تھا۔ اس کے نرخ ہر علاقے میں جدا جدا ہوتے تھے۔

2۔ دستور کشی و چہل یک: کشتی جو سامان لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی، اس کے سامان کا چالیسواں حصہ محصولات کی مد میں لیا جاتا تھا۔

3۔ بندرگاہ اور کسٹم کے محصولات۔

4۔ گاؤں شماری۔

5۔ مویشیوں پر داغ بندی۔ اس سے ان قبائل کو نقصان ہوتا تھا جن کا گزارا مویشیوں کی پرورش پر ہوتا تھا۔

6۔ اورنگزیب کے زمانے میں جزیہ، جو غیر مسلموں سے لیا جاتا تھا۔

اگرچہ ان میں سے کچھ محصولات مغل حکمرانوں کی جانب سے معاف کردیے گئے تھے مگر پھر بھی یہاں کے مقامی عہدے دار انھیں وصول کرتے تھے۔ جہاں تک جاگیردار طبقہ کا تعلق ہے وہ حکومت کا مددگار تھا اور تقریباً تین چوتھائی زمینیں اس کے قبضہ میں تھی۔ سبط حسن اس ضمن میں لکھتے ہیں ''بڑے بڑے جاگیردار شاذ و نادر ہی اپنی جاگیروں پر جاتے تھے۔ وہ خود شاہی دربار سے منسلک رہ کر آگرہ، دہلی اور لاہور میں عیش کی زندگی گزارتے اور جاگیر کی دیکھ بھال عاملوں کے سپرد کردیتے''۔

اس صورت حال سے شاہ عنایت کو اندازہ ہوا کہ غریب کسان نچلے اور دبے ہوئے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا بڑے پیمانے پر استحصال ہو رہا ہے۔ انھیں یہ راز معلوم ہوگیا تھا کہ معیشت میں اصل چیز پیداواری عمل ہے۔ سید سبط حسن اپنی کتاب نوید فکر میں پیداواری عمل کے حوالے سے لکھتے ہیں اگر چند افراد کی ذاتی ملکیت ہوتو دولت کی مساوی تقسیم کیونکر ممکن ہوگی؟ اصل مساوات وہ ہے جو پیداواری عمل کے دوران قائم ہو نہ کہ تقسیم کے دوران، ورنہ چوروں اور ڈاکوؤں کا ٹولا بھی مال کو آپس میں بانٹ کر کھاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم پیداواری عمل میں مساوی شرکت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لہذا صوفی شاہ عنایت نے پیداواری عمل میں مساوی شرکت پر زور دیا''۔ انھوں نے کہا کہ کھیتی باڑی اجتماعی اصولوں پر کی جائے، پیداواری عمل میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں اور پیداوار کو حسب ضرورت آپس میں تقسیم کرلیں۔ یہ وہی بات ہے جسے آج کل خوراک کی خود مختاری (Food Sovereignty) کہا جارہا ہے۔ صوفی شاہ عنایت کے مرید فقیروں نے یہ تجویز بخوشی منظور کرلی اور اجتماعی کھیتی باڑی میں مصروف ہوگئے۔

صوفی شاہ عنایت کا یہ تجربہ بھی کامیاب ہوا۔ ٹھٹھہ میں ان کے مرید کسان ریاستی محصولات سے آزاد ہوئے اور ان کی زندگی خوشحالی کی طرف گامزن ہوئی۔ اس تجربے کی کامیابی کا چرچہ بھی ہونے لگا اور علاقے کے دوسرے کسان بھی آپ کے حلقہ میں آنے لگے اور آپ کے مرید دن بہ دن بڑھتے گئے۔ اکثر جگہوں پر اجتماعی زراعت کا مطالبہ کیا جانے لگا جو کہ جاگیردار اور زمیندار طبقہ کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ یہ صورتحال دیکھ کر ٹھٹھہ کے جاگیردار اور ریاستی صوبیدار صوفی شاہ عنایت کے خلاف ہوگئے کیونکہ اس نظریہ کی وجہ سے کسانوں پر ان کا کنٹرول کم ہوتا جارہا تھا۔ کسان، زمینداروں کے استحصالی شکنجے سے آزاد ہورہے تھے اور جاگیردارانہ نظام ریزہ ریزہ ہوکر بکھرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ٹھٹھہ کے زمینداروں اور ریاستی صوبیداروں نے شاہ عنایت کے خلاف سازشیں شروع کردیں۔ مرکز میں مغل حکمراں فرخ کے کان بھرے اور کہا کہ

شاہ عنایت دعویٰ سلطنت کررہے ہیں اور خلیفۃ اللہ کا حکم ماننے سے انکار کررہے ہیں۔

صوفی شاہ عنایت امن پسند انسان تھے۔ مگر انھوں نے کسانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور یہ جدوجہد بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ گئی۔ یہ جنگ چار مہینے تک جاری رہی۔ جب ریاست کی پیشہ ور فوج شکست کے کنارے پہنچ گئی تو اس نے دغا و فریب سے کام لیا۔ صلح کے بہانے صوفی شاہ عنایت کو گرفتار کیا گیا اور قید کرنے کے بعد شہید کردیا گیا۔

کچھ مورخین کا خیال ہے کہ صوفی شاہ عنایت شہید کی تحریک کی ناکامی کی وجہ اس وقت کے سماجی حالات تھے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا تحریک کو کامیاب کرنے کے لیے وقت اور حالات کا انتظار کرنا پڑتا ہے؟ یا معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور برائیوں کے خلاف بغیر کسی انتظار کے منظّم ہوکر کھڑا ہونے کو انقلاب کہا جاتا ہے؟

آج بھی صوفی شاہ عنایت شہید کے مزار پر عرس میں صوفی فنکار آکر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پورے سندھ سے عقیدت مند عرس میں شریک ہوکر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں مگر افسوس کہ شاہ عنایت شہید کے نظریات اور فکر پر کوئی پروگرام نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی تحریک کو اجاگر کیا جاتا ہے، اگرچہ آن کا نعرہ ''جو کھیرے سو کھائے'' مطلب ''جو بوئے وہ کھائے'' سندھ میں ایک انقلابی نعرے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ آج بھی ایسی ہی جدوجہد کی ضرورت ہے کیونکہ استحصال آج بھی ہورہا ہے اگرچہ اس کی شکل بدل چکی ہے آج استحصالی قوتیں زیادہ منظّم اور طاقتور ہوکر کسانوں کا استحصال کررہی ہیں کیونکہ ان کا مقصد صرف اپنے طبقے کا مفاد ہے جو سرمایہ دار، جاگیردار اور دیگر قوتوں کے اتحاد کی شکل میں نظر آتا ہے۔

پاکستان میں زمین پر بیرونی سرمایہ کاری کے اثرات: الظاہرہ کیس

ارشاد سومرو

انسان اور ہر جاندار کے زندہ رہنے کا واحد ذریعہ خوراک ہے۔ آج کل دنیا کی بڑی بڑی کمپنیاں خوراک کی پیداوار کے لئے زمین ٹھیکہ پر لے رہی ہیں تاکہ خوراک کی زیادہ پیداوار سے منافع حاصل کرسکیں۔ اس مقصد کے لیے چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو زمین سے ہٹایا جارہا ہے جس سے ان کا روزگار ختم ہوتا جارہا ہے۔ آج میرپور خاص کا ایک کیس پیش کیا جارہا ہے جہاں ابوظہبی کی کمپنی الظاہرہ (Aldahra) نے زمین ٹھیکہ پر لے رکھی ہے۔

تعارف:

الظاہرہ ابوظہبی کی ایک زرعی کمپنی ہے جس کی بنیاد 1995 میں رکھی گئی۔ اس کمپنی نے پاکستان کے علاوہ دنیا کے کئی ممالک مثلاً مصر، سعودی عرب، اردن، چین اور کوریا میں کئی ہزار ایکڑ زمین ٹھیکے پر لے رکھی ہے جن پر وہ مختلف قسم کی زرعی اشیاء، جن میں مویشیوں کا چارہ بھی شامل ہے، کی پیداوار کر کے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر رہی ہے۔ اس کمپنی کی بنیادی پیداوار الفا الفا اور رہوڈس نامی گھاس ہیں جنہیں الظاہرہ یہ مختلف ممالک میں پیدا کر کے مختلف اقسام کی اشیاء بنائی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ممالک میں چاول، سبزی اور کھجور کی کاشت کی جارہی ہے۔

شروعات:

پاکستان میں اس کمپنی کی شروعات 2007 میں کی گئی۔ صوبہ سندھ کے ضلع میر پور خاص میں 3,200 ایکڑ زمین دس سال کے عرصے کے لیے ٹھیکہ پر حاصل کی گئی۔ کمپنی کا کہنا ہے کہ اس نے یہ زمین فی ایکڑ 10,000 روپے معاوضہ پر لی ہے لیکن بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ معاوضہ بڑھا کر 25,000 کر دیا گیا ہے۔ اس پورے 3,200 ایکڑ پر صرف الفا الفا اور رہوڈس گھاس کی کاشت کی جارہی ہے۔

زمین کا معاہدہ:

میر پور خاص میں ٹھیکے پر لی گئی زمین صوبائی وزیر سندھ علی نواز شاہ کی ملکیت ہے جو کہ ملک کے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان میں آج بھی جتنے بھی سیاستدان ہیں وہ جاگیردار یا سرمایہ دار ہیں۔ اسمبلیوں اور قانون ساز اداروں میں بھی انھی کی نمائندگی ہے۔ وہ اس نمائندگی کے زور پر اپنے فائدے کی قانون سازی کروا لیتے ہیں۔ صوبائی وزیر علی نواز شاہ نے بھی غیر ملکیوں کے زمین پر قبضے کے لیے بنائے جانے والے قوانین کو خوش آمدید کہا۔ بیرونی کمپنیوں کو اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ پاکستان میں آکر بیرونی سرمایہ کاری کریں۔

الظاہرہ کی انتظام کاری:

الظاہرہ کمپنی میں جتنی بھی انتظامیہ ہے وہ غیر ملکی ہے۔ 3,200 ایکڑ پر صرف 50 ملازمین تمام کام خودکار مشینوں کی مدد سے کرتے ہیں۔ یعنی اتنے بڑے پیمانے پر کئی خاندانوں کی روزی اور مزدوری ختم کر کے صرف 50 ملازمین سے کام لیا جارہا

ہے۔ مقامی آبادیوں کو اپنے مویشیوں کے لیے گھاس لینے تک کی اجازت نہیں ہے۔ اس کمپنی میں ملازمین کی زیادہ سے زیادہ اجرت 40,000 روپے اور کم سے کم مزدوری 6,000 روپے ماہانہ سے بھی کم ہے۔

پیداوار اور پیداواری طریقے:

ٹھیکے پر لی گئی زمین پر الفا لفا اور رہوڈس گھاس کی پیداوار کی جاتی ہے۔ یہ گھاس سردیوں کے موسم میں دو مہینے کے بعد ایک بار کاشت کی جاتی ہے اور ایک مہینے میں دو بار کاٹی جاتی ہے۔ ایک ایکڑ سے 14 سے 15 من پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ اس زمین پر خود کار مشینوں کی مدد سے کام لیا جاتا ہے گھاس بھی کاٹتی ہیں اور 14 سے 15 من کی گانٹھ بھی بنالیتی ہیں۔ گھاس کا بیج آسٹریلیا سے درآمد کیا جاتا ہے۔ گاؤں کے کچھ لوگوں کا کہنا تھا کے یہ گھاس عرب کے اونٹوں کے لیے اگائی جاتی ہے پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر صرف اونٹوں کے لیے گھاس نہیں اگائی جاسکتی۔ دیگر حوالوں جیسے انٹرنیٹ پر تلاش کیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ گھاس کاغذ، چھابڑیاں اور چٹائیاں بنانے کے کام میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

الظاہرہ کا دعوی ہے کہ وہ قدرتی طریقہ کار کو مدنظر رکھ کر کاشت کرتی ہے جبکہ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر مشینری اور کیمیائی کھاد کے استعمال سے ماحول کو کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے؟ یہ بھی عوام کو بیوقوف بنانے کا ایک ہتھکنڈہ ہے۔

زمین حاصل کرنے کے ہتھکنڈے:

الظاہرہ کمپنی نے لوگوں سے زمین ہتھیانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ وہاں اپنے آباؤ اجداد کے زمانے سے مقیم آبادیوں کو مختلف طریقوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا گیا۔ ان کی اجرت کم کر دی گئی۔ ان پر قرضے چڑھائے گئے۔ زمین کے کافی حصہ کو خالی چھوڑ دیا گیا جس کی وجہ سے لوگوں کی مزدوری کم سے کم ہوتی گئی۔ نتیجے میں لوگوں نے زمین پر کام کرنا چھوڑ دیا۔ وہاں کے مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر سال بھر کام کرنے کے بعد بھی فصل کا مختص کردہ حصہ زمیندار اخراجات کی مد میں کاٹ لے تو زمین پر کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ زمین چھن جانے کی وجہ سے وہاں بیروزگاری میں اضافہ ہوا اور مقامی لوگوں نے اپنے لئے متبادل روزگار مثلاً ڈرائیور، مکینک، درزی، شہر میں کھلی مزدوری تلاش کرنا شروع کیا۔

پانی کی کمی:

الظاہرہ کمپنی آبپاشی کے لئے بڑی بڑی مشینری کا استعمال کر رہی ہے جس کی وجہ سے علاقے کو پانی کی کمی کا سامنا ہے۔ اس کمپنی نے محکمہ آبپاشی کے ذریعے پکے نالے بنوائے۔ الظاہرہ کمپنی کے لیے خاص طور پر جمڑاؤ کنال سے شاخ نکالی گئی ہے۔ بڑی بڑی مشینوں اور لفٹ سے پانی اٹھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے آخری حصے والے کاشت کار متاثر ہوتے ہیں ۔ ان کسانوں کو پندرہ دن میں چند گھنٹے کے لیے پانی فراہم کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی فصل بھی کم اترتی ہے۔ چونکہ زمین کا مالک ایک بڑا جاگیردار اور وزیر ہے اس لیے لوگ اپنا حق مانگنے سے ڈرتے ہیں۔ اس 3,200 ایکڑ زرعی اراضی سے کم از کم 96 ہزار من گندم حاصل ہوسکتی ہے لیکن وہاں صرف گھاس پیدا کی جارہی ہے جس سے خوراک کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ تقریباً 5 گاؤں کی آبادیاں خوراک یعنی گندم تک رسائی میں مشکل کا سامنا کررہی ہیں۔ روزگار کے مسائل پہلے ہی واضح کردیے گئے ہیں۔

دیہی ترقی:

اس علاقے کی ترقی کے لیے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے ہیں ۔گاؤں کے سرکاری اسکول اساتذہ کی غیر حاضری کی وجہ سے ویران ہیں ۔صحت عامہ کی سہولت میسر نہیں ہے حالانکہ گاؤں میں بنیادی صحت کے مرکز کی عمارت موجود ہے۔

لوگوں کی نقل مکانی:

الظاہرہ کمپنی کو زمین کا ٹھیکہ ملنے کے بعد کئی خاندان روزگار کی تلاش میں دیگر شہروں اور قصبوں کی جانب نقل مکانی کر چکے ہیں ۔

عورتوں پر اثرات:

زمین چھن جانے کی وجہ سے گاؤں کی عورتوں کا روزگار بھی ختم ہوگیا ہے اور وہ اپنے گھروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ مسلمان عورتوں کا کہنا ہے کہ وہ دور دراز کے گاؤں جا کر کپاس کی چنائی اور گندم کی کٹائی نہیں کرسکتیں۔ ہندو عورتیں بھی پریشان ہیں کیونکہ کرایہ دے کر دور جانا پڑتا ہے۔

مزاحمت:

وہاں زیادہ تر آبادی ہندو، میگھوار ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ وڈیروں اور سرمایہ دار کے زیر اطاعت رہیں گے کیونکہ مزاحمت کی صورت میں زمین کے بعد اب ان کے گھر بھی چھن جائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ وڈیرا شاہی اور افسر شاہی راج میں مذہبی اقلیتیں اور چھوٹے بے زمین کسان خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ سوائے عوامی مزاحمت کے اور کوئی راستہ ممکن نہیں۔

شہری ترقی کے منصوبوں کے ذریعے زمین پر اجارہ داری

زبیدہ بروانی

زبیدہ بروانی نے ذوالفقار آباد منصوبے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ذولفقار آباد ایک نئے شہر کا نام ہے جو ضلع ٹھٹھہ میں چار تعلقہ جاتی، شاہ بندر، کیٹی بندر، کھارو چھان پر مشتمل ہوگا۔ یہ ضلع ٹھٹھہ کے ساحلی علاقے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ساحلی علاقے دنیا میں خاص توجہ کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ جب بلوچستان میں گوادر بندرگاہ بننا شروع ہوئی تو اس سے پاکستانی اور بیرونی سرمایہ دار طبقے کی بہت زیادہ توقعات وابستہ تھیں لیکن بلوچستان میں مزاحمتی تحریکوں کے نتیجے میں اس پر پانی پھر گیا۔ اب سوچا یہ گیا کہ سندھ کے ساحلی علاقوں کو کسی طرح استعمال میں لایا جائے۔ اس کے لیے صدر زرداری کی خواہش پر ذولفقار علی بھٹو کے نام پر یہ شہر بنایا جارہا ہے۔ سندھ کے لوگوں کو 40 سال سے بھٹو کے نام پر بیوقوف بنایا گیا، اب یہ نئی اسکیم بھی بھٹو کے نام پر پیش کی جارہی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ شہر کس طرح بنایا جارہا ہے۔ یہ چار تعلقہ دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر آباد ہیں۔ بیچ میں ایک چھ کلو میٹر لمبا پل بنا کر آپس میں ملا دیا جائے گا۔ اس شہر کو بنانے کے لیے 16 لاکھ ایکڑ زمین 60 درکار ہوگی۔ 16 لاکھ ایکڑ زمین میں سے 12 لاکھ ایکڑ سے زائد زمین سمندر کے اندر ہے۔ ابتدائی طور پر 13 لاکھ ایکڑ سے زائد زمین سے کام چلایا جائے گا جس میں سے 3 لاکھ ساٹھ ہزار کی ایکڑ زمین پر مقامی آبادیاں آباد ہیں جو کہ ماہی گیری (مچھیرے) اور زراعت کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ باقی 9 لاکھ ساٹھ ہزار زمین سمندر سے حاصل کرنی ہے۔ اس منصوبے کا پی سی ون ابھی تک نہیں بنایا گیا ہے جو کہ کسی بھی منصوبے کو چلانے کے لیے ضروری دستاویز ہوتا ہے۔ یہ منصوبہ چین کی سرمایہ کاری کی مدد سے تعمیر کیا جائے گا۔ چین کو ہمارے سمندر سے ایسا راستہ چاہیے جس سے وہ اپنی بحری

تجارت آسان بنا سکے۔ اس منصوبے کا منیجنگ ڈائریکٹر ایک ریٹائرڈ فوجی ہے جس کی تنخواہ نو لاکھ روپے ہے۔ میرے خیال میں جب بھی ہمارے ملک میں کوئی کام کیا جاتا ہے تو فوجیوں کو چنا جاتا ہے جو کہ ذہنی طور پر بھی ریٹائرڈ ہوتے ہیں اور جسمانی طور پر بھی۔ ذوالفقار آباد منصوبے کی کسی بھی طرح کی کاروائی تک لوگوں کو رسائی نہیں دی جارہی۔ اس کے ڈائریکٹر آپریشن کا ڈومیسائل سندھ کا نہیں ہے۔ یہ 1974 کے ایک ایکٹ کی خلاف ورزی ہے۔ 30 ارب روپے سے زائد کے ہر منصوبے کے لیے کمیٹی برائے قومی اقتصادی کونسل (Executive Committee of the National Economic Council /ECNEC) کی منظوری درکار ہوتی ہے تاہم یہ منصوبہ ابھی تک منظوری کے لیے پیش نہیں کیا گیا جو آئین کی خلاف ورزی ہے۔

یہ منصوبہ چین کے شہر شین زین کی طرز پر بننے جارہا ہے جس کی آبادی ایک کروڑ ہے۔ چین بے دخلی کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔ وہاں ایسے کئی پروجیکٹ بنائے گئے جن کے نتیجے میں مقامی لوگوں کو بے دخل کیا گیا۔ یہ شہر سندھ کے لوگوں کے لیے نہیں بن رہا۔ اس منصوبے کے اعلان کے ساتھ ہی چاروں تعلقہ کے لوگوں کی زرعی زمین کی ملکیت کے کاغذات ان کے پاس ہونے کے باوجود محکمہ ریونیو نے منسوخ کردیے اور زمین کو سرکاری ملکیت قرار دے دیا۔ اندازاً ایک سے ڈیڑھ لاکھ لوگوں صرف ایک اخباری خبر نے بے گھر کر دیا۔ جب احتجاج شروع ہوا تو صرف زبانی تسلیاں دی گئیں کے یہ زمین انھی کی ملکیت ہے لیکن تحریر میں کہیں نہیں ہے۔

ماحول کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ شہر جہاں تعمیر ہونے جارہا ہے وہ انڈس ڈیلٹا کا علاقہ کہلاتا ہے۔ یہ دنیا کا چھٹا بڑا ڈیلٹا ہے۔ یہاں دریائے سندھ سمندر میں جاکے گرتا ہے۔ یہاں ایک مکمل ماحولیاتی نظام موجود ہے۔ یہاں سے ماہی گیر روزگار حاصل کرتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے رام سر کنونشن (Ramsar Convention) میں سندھ ڈیلٹا کو محفوظ علاقہ قرار دیا ہے۔ حکومتیں ایک طرف تو ایسے کنونشن پر دستخط کرتی ہیں اور دوسری طرف اس طرح کے منصوبے شروع کردیتی ہیں۔ سمندر میں موجود تیمر (Mangroves) کے جنگلات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ تیمر کے جنگلات کی جڑوں میں مچھلی پلتی ہے۔ یہ ہمیں قدرتی آفات سے محفوظ رکھنے کے کام آتے ہیں۔ مثلاً سونامی اور سائیکلون سے بچانے کے لیے قدرتی ڈھال مہیا کرتے ہیں۔ اس وقت بڑے پیمانے پر موسمی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اگر کوئی قدرتی آفت آجائے تو ہماری حکومت میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ پھر قدرت کی عطا کی ہوئی چیز کو ہم کیوں ختم کر رہے ہیں؟ ذوالفقار آباد منصوبے سے تین لاکھ لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہورہے ہیں۔ لوگوں سے ان کا روزگار اور خوراک کے مواقع چھن رہے ہیں۔

کراچی میں لوگوں کی آبادیاں ہٹا کر اسٹیل مل، مرینہ کلب اور ڈیفنس اتھارٹی بنائی گئیں۔ شیریں جناح کالونی میں لوگوں کی آبادیاں ہٹا کر ایک فوارہ 22 کروڑ روپے مالیت کا تعمیر کرایا گیا۔ ملک میں ایک فوارہ لگانے کے لیے بائیس کروڑ روپے ہیں لیکن جو لوگ بھوک سے مر رہے ہیں؟ سندھ میں تین سال سے سیلاب سے متاثرہ لوگوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ دس ہزار اسکول ویران پڑے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی بہت ہوئی ہے پر کس قیمت پر؟ لوگوں کی بے دخلی پر، لوگوں کے روزگار اور زمین چھن جانے پر، ماحول کی بربادی پر۔ ہمیں ایسی ترقی نہیں چاہئے اس لیے ہم اس منصوبہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

پائیدار ترقی: پاکستان میں زمینی اصلاحات

محمد رفیق

زمین اور انسان کا رشتہ بہت پرانا ہے ۔ زمین کا تعلق ہماری معیشت، سیاست، ماحولیات اور سماج سے ہے۔ پائیدار ترقی کے چار عوامل براہ راست زمین سے تعلق رکھتے ہیں ۔

تاریخی پس منظر:

قبل از تقسیم یہ خطہ برصغیر کہلاتا تھا۔ برصغیر کی تاریخ میں نجی ملکیت کا تصور ہمیں نہیں ملتا۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کے نوآبادیات سے پہلے برصغیر خوراک کی ٹوکری کہلاتا تھا، جبکہ آج یہ خطہ خوراک کی خود مختاری کے حوالے سے شدید بحران کا شکار ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ فرق کب ،کہاں اور کیسے آیا ؟اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟ عالمی بھوک کے گوشوارے کے مطابق پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور چین بھوک میں سب سے اوپر ہیں۔ پاکستان میں 25 فیصد سے زائد لوگ بھوک کا شکار ہیں ۔تو یہ خوراک کی ٹوکری کہاں گئی؟ الظاہرہ کھا گئی یا ذوالفقار آباد؟ انگریز یہاں آئے تو ان کے پاس جاگیرداری کا بہت تجربہ تھا کیونکہ انھوں نے کافی سالوں اس کو بھگتا تھا۔ اس کے بعد وہاں سرمایہ داری آئی۔ انگریز پوری حکمت عملی کے ساتھ برصغیر آئے۔ انگریز سرمایہ دار کو علم تھا کہ لوگوں سے کس طرح کام لینا ہے۔ اس نے زمین پر کنٹرول کے لیے موجودہ پاکستان کے تین حصے کیے۔ ایک حصہ مغربی پنجاب، سندھ اور خیبر پختو خواہ کا وہ پہاڑی تھا جہاں بہت اچھا نوآبادتی نظام دیا گیا۔ دوسرا ریاستیں جیسے خیرپور اور بہاول پور، تیسرا خان آف قلات، خاران، بٹگرام، دیر، سوات۔ وہاں کے لوگوں کو خود مختار نظام دیا گیا تھا۔ یہ تین نظام تقسیم کی بنیاد پر اس لیے دیئے گئے تاکہ نجی ملکیت کے تصور کو فروغ حاصل ہو کیونکہ

انگریزوں کو دولت چاہئے تھی۔ کسان کی کمائی میں سے حصہ چاہئے تھا اور تجارت کے راستے چاہئے تھے۔ اس لیے انگریز نے تجارت کے عوض اشتراکی قبائلی سلسلہ قائم و دائم رکھا۔ یہ قبائلی اور ریاستی علاقے پنجاب، سندھ، خیبر پختون خواہ اور بلوچستان میں قائم کیے گئے جن میں قلات، خاران، بٹگرام، دیر، سوات، بہاولپور، خیرپور، بلوچستان کے علاقے شامل تھے۔ یہ سارے ایسے علاقے تھے جہاں تجارت کے عوض خود مختار نظام کو نافذ کیا گیا۔

محل داری نظام:

سندھ اور خیبر پختو خواہ میں محل داری نظام متعارف کروایا گیا۔محل سے یہاں مراد زمیندار کی حویلی ہے۔ اس نظام میں گاؤں کو بنیادی رکن تصور کیا گیا۔ زمین کا انتظام، آمدنی پر اختیار کا پہلا تصور انگریزوں نے دیا۔ اس نظام کو چوہدری، وڈیروں اور خانوں کے حوالے کیا گیا۔ اس طبقہ کو اپنے لوگوں کی نگرانی اور محصولات کی وصولی کی ذمہ داریاں دی گئیں۔

زمینداری: اگر ایک زمیندار مالک ہوگا تو وہ زمیندار کا علاقہ کہلائے گا۔

پٹے داری: دو تین زمینداروں میں اگر زمین تقسیم کر دی جائے تو وہ پٹہ داری کہلاتی ہے۔

بھائی چارہ: دو تین بڑے کسان مل کر حصہ بانٹ لیں تو یہ بھائی چارہ کہلائے گا۔

طبقاتی نظام:

انگریز راج سے پہلے گاؤں میں زرعی اجناس اور زمین کے بیچنے اور خریدنے کا تصور رائج نہیں تھا۔ اس وقت بھوک کا عالم بھی نہیں تھا۔ انگریزوں نے نجی ملکیت کا حق متعارف کروایا اور کسانوں کو زمینیں دے کر جاگیردار بنایا تاکہ ہم پر حکمرانی کی جاسکے۔ 1890 کے قریب لوگوں کی تقسیم کی گئی کہ کون کاشت کار ہے اور کون نہیں۔ یوں زمین کی غیر منصفانہ تقسیم سے ایک خاص حکمران طبقہ پیدا ہوا۔ بھوک بڑھنی شروع ہوئی اور اسی دور میں ہی مزاحمتی عمل کا آغاز ہوا۔ ان طبقوں سے ہماری زندگیوں میں معاشی اور سیاسی عدم توزان بڑھا۔ انگریز راج نے گاؤں کی سطح پر باقاعدہ ریکارڈ محفوظ کرنا شروع کیا تو گاؤں میں جو زمین کاشت نہیں کی جارہی تھی اسے ''شاملات'' قرار دیا گیا۔ گاؤں میں رہنے والے ہر فرد کا اس شاملات میں حصہ شامل ہوتا تھا۔ دریاؤں کے آس پاس کے کچے کے علاقے ''رگ'' کہلاتے تھے۔ یہ چرا گاہیں تھی جنہیں حکومتی ملکیت قرار دیا گیا۔

نہری نظام:

اوپر بیان کیا گیا انگریزوں کا پہلا دور تھا۔ اس کے بعد انھوں نے نہری نظام بنایا۔ نہروں نے طبقاتی نظام کو گہرا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ جہاں سے نہر گزرتی تھی وہاں کی زمین کی قیمت بڑھنا شروع ہو جاتی تھی۔ پھر زمین کی قطاط اور الاٹمنٹ کا نظام شروع ہوا۔ آبپاشی کا محکمہ بنایا گیا جس میں تحصیل دار اور پٹواری ہوتے تھے۔ نہروں کے جال بچھانے کے بعد جب محکمہ جاتی تصور آیا تو گاؤں کی سطح پر جتنی بھی انتظامیہ تھی اسے ناکارہ بنادیا گیا۔ تحصیل اور ضلع کی افسر شاہی نے یہ نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عوام اور ریاست کی مشینری کے درمیان گاؤں کی سطح پر ایک درمیانی رشتہ بنانے کے لیے نمبر دار کا نظام آیا۔ اس نظام نے پیداوار تو بڑھائی لیکن چھوٹے اور بے زمین کسان طبقہ کو پیدا کیا اور ساتھ ساتھ ان پر ظلم کے دروازے کھول دیے۔

رعیت کا نظام:

سندھ میں جاگیرادری نظام پہلے سے موجود تھا اس لیے وہاں رعیت کا نظام متعارف کروایا گیا۔ حکومت نے براہ راست ہاریوں کو زمین لیز پر دی۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے سندھ کی فالتو زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ انگریز یہ زمینیں پٹواریوں، فوجیوں اور بیوروکریٹس کو بخشش میں بانٹتے تھے۔

تقسیم ہند:

تقسیم ہند کے وقت ہمارے حکمرانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو زبردستی ہندوستان بھیج دیا۔ یہ لوگ تقریباً 60 لاکھ سے 80 لاکھ ایکڑ زمین چھوڑ کر گئے تھے۔ وہاں سے آنے والوں نے 45 لاکھ ایکڑ زمین پر اختیارات حاصل کیے۔ اس وقت حکومت نے یہ قانون بنایا کہ ان لوگوں کو زمین دی جائے گی جو جٹ، سید، گجر، راجپوت اور آرائیں ہوں گے۔ باقی کوئی طبقہ زمین پر اختیار حاصل نہیں کر سکتا۔ تین لاکھ سے آٹھ لاکھ ایکڑ زمین حکمران طبقے نے زبردستی ہتھیا لی۔

سیاسی تقسیم:

سوال یہ اٹھتا ہے کہ زمین کی تقسیم کیوں نہیں کی جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت پنجاب کے پچاس فیصد حکمران جو مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے، جاگیردار تھے۔ ان سے کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ زمین کی تقسیم کے حق میں فیصلہ دیں گے۔ آج

بھی یہ صورت حال برقرار ہے۔ 1959 اور 1972 کے زمینی اصلاحات کے ذریعہ صرف چند ہزار گھرانوں کو نوازا گیا۔

اثرات:

پاکستان میں چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے حالات زندگی پر جاگیرداری کے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوئے:

1۔ انہیں ''کمی'' کہہ کر حقارت کا نشانہ بنایا گیا۔

2۔ انہیں ان پڑھ ہونے کی بناء پر نظر انداز کر دیا گیا۔

3۔ کہا گیا کہ اگر زمینی اصلاحات ہوئیں تو دیہی معیشت متاثر ہوگی۔

ہمارا نظریہ ہے کہ زمین صرف اس کی ہے جو خود زمین پر ہل چلاتا ہے۔ زمین کی ملکیت، تمام پیداواری قدرتی وسائل پر قبضہ اور اختیار کا حق یقیناً چھوٹے اور بے زمین کسان کا ہونا چاہیے۔

چوتھا سیشن

پائیدار ترقی اور بیج کی سیاست

کمپنیوں کی بیج پر اجارہ داری: کسانوں پر اثرات

اسماعیل گورچانی

پاکستان کسان مزدور تحریک کے ممبر اسماعیل گورچانی نے کمپنیوں کے بیجوں کے چھوٹے کسانوں پر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ 2011 کے سیلاب نے چھوٹے اور بڑے کاشتکاروں کو متاثر کیا۔ میر پور خاص کے علاقے کی تفصیلات بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ سیلاب کے باعث ہماری فصلیں اور مکانات تباہ ہوگئے۔ بارش اور سیلاب کے بعد ہماری بنیوں (کھیتوں) میں سیلابی پانی کھڑا رہنے کی وجہ سے زمین کمزور ہوگئی تھی۔ گندم بونے کی گنجائش نہیں تھی۔ کسانوں نے بارشوں سے اپنی کپاس کی فصل کی تباہی کے بعد سورج مکھی اگانے کا فیصلہ کیا۔ کسانوں نے سینجنٹا اور آئی سی آئی کے ہائی برڈ بیج اپنی زمین پر بوئے۔ عام طور پر سورج مکھی کا پھول بیج سے بھرا ہوتا ہے مگر ان پودوں کے پھولوں میں بیج نہیں تھے، اگر تھے بھی تو بہت کم اور پتھر کی طرح سخت۔ نتیجے میں ہماری فصل خراب ہوگئی۔ ہم پہلے ہی سیلاب سے ہونے والے نقصان کا ازالہ نہ کر پائے تھے کہ اب اس فصل سے مزید نقصان ہوگیا۔ بہت سے محکموں کے دروازے کھٹکھٹائے پر ہماری کوئی سنوائی نہ ہوئی۔

اسی طرح سندھ میں ٹماٹر کے بیجوں کی ایک تھیلی دو ہزار روپے میں ملتی ہے۔ دس تھیلیاں ایک ایکڑ میں ڈالنے پر 20 ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ جب منڈی میں ہمارا ٹماٹر پہنچتا ہے تو بھارت کے ٹماٹر مارکیٹ میں آرہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ٹماٹر کی دس کلو کی تھیلی 500 روپے میں اور بھارت کی 100 روپے میں فروخت ہوتی ہے۔ یہ کمپنیاں جعلی بیج، ادویات صرف ہم لوگوں کو لوٹنے اور منافع کمانے کے لیے منڈی میں لاتی ہیں۔ ہمیں کمپنیوں سے نقصان کا معاوضہ واپس چاہیے۔ مزدور کسان پہلے بھی پس رہے تھے، اب بھی پس رہے ہیں۔ کسانوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ گاؤں میں جاگیردار کسان کو تعلیم حاصل کرتا نہیں دیکھ سکتے۔ ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ اپنا بیج استعمال کریں گے اور ملک سے ان کمپنیوں اور ان کے بیجوں کو در بدر کردیں گے۔

پائیدار زراعت میں بیج کا کردار

ظاہر اللہ

انسانی زندگی کی ابتداء سے بیج کی بھی ابتداء ہوئی ہے۔ زندگی اور موت کا تعلق بیج سے جڑا ہے۔ جب تک بیج ، بیج سے دانہ اوراس دانہ سے رزق نکلتا رہے گا ہم زندہ رہیں گے۔ خیبر پختو خواہ میں اس وقت 70 فیصد کسانوں کے پاس اپنا بیج نہیں ہے۔ یہاں کے کسان ہائی برڈ اور جینیاتی بیجوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ ہمیں پی کے ایم ٹی کی کوششوں سے اپنے روائتی بیجوں کو ختم ہونے سے بچانا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو آنے والی نسلوں کو ہم غلامی کا تحفہ دیں گے۔ یہ غلامی ہی ہے کہ ہم کمپنیوں کے بیج زیادہ پیداوار کی لالچ میں استعمال کر کے خوش ہوتے ہیں۔ بیجوں کو محفوظ کرنے میں ہماری خواتین کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ پہلے ہماری نانیاں، دادیاں بیجوں کو محفوظ کر لیتی تھیں، پھر انہیں بویا کرتی تھیں۔ اب یہ چیز کم دیکھنے میں آتی ہے البتہ کچھ علاقوں میں یہ روایت اب بھی قائم ہے۔ آنے والے وقتوں میں جس کے پاس اپنا بیج ہوگا وہی محفوظ ہوگا، چاہے وہ زمین کا مالک ہو یا نہیں۔ ہمیں ان بیجوں کی اپنی اولادوں کی طرح حفاظت کرنی ہے۔

بیج کی سیاست

ولی حیدر

ملکی اور عالمی تناظر میں بیجوں کی سیاست کے حوالے سے ولی حیدر کا کہنا تھا کہ ظاہر اللہ اور اسماعیل گورچانی نے کسانوں کے جن مسائل کی نشاندہی کی، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیج کی سیاست کس رخ پر جارہی ہے۔ بین الاقوامی اور ملکی سطح پر بیج کی سیاست صرف ایک ہے کہ کس طرح بیجوں پر قبضہ کیا جائے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارے پیداواری وسائل کیا ہیں؟ مثال کے طور پر ایک فیکٹری میں مشینری وہاں کے پیداواری وسائل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح سے زراعت کے پیداواری وسائل میں بیج، کھاد، پانی، زمین اور زرعی آلات شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ طاقتوں کو یہ بات سمجھ آئی کے پیداواری وسائل پر قبضہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دار طبقہ یہ بات سمجھ چکا تھا کہ بیج کے علاوہ زراعت کے تمام پیداواری وسائل انسان بنا سکتا ہے لیکن بیج قدرتی ہے، اس سے منافع نہیں کمایا جاسکتا۔ اسی سوچ کی بنیاد پر سرمایہ دار نے تحقیق شروع کی کہ کس طرح سے بیج کو ایسی شکل دی جائے کہ وہ ایک جنس بن جائے جسے بازار سے خریدا اور بیچا جاسکے۔

ہائی برڈ بیج کا تصور:

بیجوں پر قبضہ کر کے کسانوں کو اپنا محتاج بنانے کی سرمایہ دارانہ سوچ کے نتیجے میں ہائی برڈ بیج کا تصور سامنے آیا۔ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر منڈی میں بیجوں کی فروخت نہیں کی جاتی تھی کیونکہ کسان اپنے بیج خود محفوظ کرتے تھے یا پھر آپس میں ادل بدل کر لیتے تھے۔ روائتی بیج کی بار بار فصل دینے کی خاصیت امریکی سرمایہ دار کو بہت پہلے سے کھٹک رہی تھی۔

امریکی سینیٹر کی 1957 میں کی گئی تقریر کا ایک اقتباس ہے کہ ''ہم دنیا کے لوگوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں اگر ہم ان کی خوراک پر قبضہ کر لیں۔ اگر ان کی خوراک پر ہمارا قبضہ ہوگا تو وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے ہمارے محتاج ہوں گے کیونکہ خوراک انسان کی سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت ہے''۔

یہ سوچ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ ہر بیج کو قبضے میں لانے کے لیے ہائی برڈ بیج کا تصور لایا گیا۔ ہائی برڈ بیج بانجھ بیج کہلاتا ہے یعنی اس میں بار بار فصل دینے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی کیونکہ پیداوار میں اضافے کا لالچ دے کر اسے اس خاصیت سے محروم کر دیا گیا ہے۔

سائنسی زراعت اور صنعتی ترقی کے نقصانات:

اس سوچ کے تحت بہت سارے ''ترقیاتی کام'' ہوئے جن کا فائدہ صرف سرمایہ دار اور حکمران اشرافیہ طبقے کو ہوا اور نقصان محکوم اور مظلوم طبقوں کو ہوا۔ اسی طرح سائنسی زراعت میں صنعتی ترقی کا فائدہ صرف سرمایہ دار طبقے اور بڑے جاگیرداروں کو ہوا۔ پاکستان میں اکثریت چھوٹے کسانوں کی ہے۔ ایسی ترقیاتی اسکیمیں لائی گئیں جو چھوٹے زمین کے مالکان کو نقصان پہنچاتی تھیں۔ میری ذاتی رائے میں مشینی زراعت سے چھوٹے کسانوں کو نقصان ہوا ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں بیروزگاری بڑھی، گاؤں سے شہروں کی طرف ہجرت کا عمل شروع ہوا۔ جب گاؤں کی آبادیاں شہر کی کچی آبادیاں بنیں تو ان میں عدم تحفظ پیدا ہوا۔ ادھر گاؤں کے لوگوں کا اپنی زندگی پر اختیار نہیں رہا جس سے ان کی زندگی بہتری کی طرف جانے کے بجائے مزید ابتری میں چلی گئی۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ صنعتی اور مشینی زراعت کو فروغ دیا گیا۔

1960 کی دہائی میں سبز انقلاب کے نتیجے میں پیداوار تو بڑھی پر کسانوں کی ترقی نہیں ہوئی۔ پاکستان کی معاشی ابتری بشمول سبز انقلاب اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ پاکستان میں جتنی بھی ترقیاتی اسکیمیں لاگو کی گئیں ان کا اکثریتی آبادی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسی طرح زراعت میں عالمی سطح پر ترقی کے اثرات ملکی سطح پر بھی پڑے ہیں۔ سرمایہ دار اور مقامی اشرافیہ کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں ہمارا کسان ابتری کا شکار ہوا لیکن ہمارا جاگیردار، سرمایہ دار بھی بنا۔

آج ہماری اسمبلیوں میں بیج کا قانون زیر بحث ہے جو کسی بھی وقت منظور ہوسکتا ہے۔ اس قانون کے تحت ہمارا کسان فصل اگانے کے بعد بیج اپنے پاس محفوظ نہیں کر سکتا نہ اگا سکتا ہے چاہے وہ ہائی برڈ بیج ہی کیوں نہ ہو۔ اس قانون سے غیر ملکی کمپنیوں، جاگیرداروں کو فائدہ اور کسانوں کو نقصان ہوگا۔ ان پالیسیوں کو آگے بڑھانے میں ہمارا جاگیردار طبقہ شامل ہے کیونکہ اس کے مفادات سرمایہ دار طبقے سے جڑے ہوئے ہیں۔ زراعت کے حوالے سے ایک بڑے اسکالر Richard Bant لکھتے ہیں:

''اب تک دنیا کی جنگوں میں اتنے لوگ نہیں مارے گئے جتنا صنعتی اور مشینی اثرات کے نتیجے میں لوگوں کو نقصان ہوا''۔

یہ صرف پاکستان نہیں بلکہ بھارت، فلپائن، انڈونیشیا اور لاطینی امریکہ بھی ہماری جیسی صورتحال کا سامنا کر رہے ہیں۔ ڈبلیوٹی او میں ٹرپس کا معاہدہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ بیج پر کسانوں نہیں بلکہ کمپنیوں کا اختیار ہو۔ ہمارے سرمایہ دار اور جاگیردار ہی نہیں بلکہ یہ عالمگیریت سے جڑی دنیا کے بیج کی سیاست ہے۔ جس کے تحت وہ پالیسیاں وضع ہوتی ہیں۔ جو آگے جا کر ہماری قومی پالیسیاں بنتی ہیں۔ پاکستان کا کارپوریٹ فارمنگ آرڈیننس اور سیڈ ایکٹ دونوں ڈبلیو ٹی او کے عالمی زرعی معاہدے (اے او اے) اور ٹرپس کے معاہدے کا نتیجہ ہیں۔ یہ المیہ ہے کہ ہمارے حکمران بین الاقوامی پالیسی ہم پر لاگو کرتے ہیں۔

اس مسئلے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہم اپنے بیج محفوظ کریں۔ 2000 میں ایک کتاب چھپی جو 90 کی دہائی میں پوری دنیا میں ہونے والی زراعت کا احاطہ کرتی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ تیسری دنیا کے 70 فیصد لوگ بیج کمپنیوں سے نہیں خریدتے تھے لیکن پچھلے 20 سالوں میں اتنی بڑی تبدیلی آئی کہ لوگوں نے باہر سے بیج خریدنا شروع کر دیے۔

پاکستان کسان مزدور تحریک نے روائتی بیجوں کو محفوظ کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ بیج کی ملکیت ہمارے ہاتھ سے گئی تو ہم خوراک بھی کھو دیں گے۔ اس کام کو چھوٹی بنیادوں پر نچلی سطح سے شروع کر کے ہمہ گیر پروگرام کی صورت میں پھیلانا ضروری ہے۔

کانفرنس میں شرکاء کے چند اہم سوالات و جوابات اور آراء

اکرم ناصر، بہاولپور، پنجاب:

سوال: 70 فیصد لوگ کمپنیوں کا بیج خرید رہے ہیں جبکہ 30 فیصد لوگ روائتی بیج کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس تناظر میں عالمی قوانین اور پاکستانی قوانین میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے؟

جواب: ولی حیدر نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ابھی تک کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہے لیکن قوانین کی تشکیل عمل میں ہے۔ بیج ہمارا ہے اوراس پر ہمارا حق ہے۔ اگر یہ قانون بن بھی گیا تو ہم اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔

علی نواز جلبانی، گھوٹکی، سندھ:

سوال: جیسے بتایا گیا کہ خیبر پختو خواہ میں 30 فیصد روائتی بیج بچا ہوا ہے تو وہ کن اجناس کا ہے؟

جواب: مکئی، جوار، گندم کا زیادہ ہے جبکہ گنے میں کہیں کہیں روائتی بیج ملتا ہے۔ سبزیوں میں روائتی بیج ختم ہونے کو ہیں۔

حاکم گل، شکارپور، سندھ:

اگر شکارپور کے حوالے سے بات کروں تو پی کے ایم ٹی کے سات آٹھ گاؤں میں سے ایک یا دو روائتی بیج استعمال کرتے ہیں۔ یہ اچھی خبر ہے کہ خیبر پختو خواہ میں 30 فیصد روائتی بیج اب موجود ہیں۔

رضوان، ہری پور، خیبر پختون خواہ:

سوال: اگر کوئی آدمی صفر سے بیج بچانے کا عمل شروع کرنا چاہے تو وہ بیج کہاں سے اور کس طرح حاصل کر سکتا ہے؟

جواب: ولی حیدر نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کے ایک مٹھی بیج ہم سے لے جائے۔ اگر آپ کے پاس اپنی زمین ہے تو ایک مٹھی بیج سے شروع کر کے روائتی بیج کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

محمد یقوب، خیر پور، سندھ:

ہم محنت کش جگ والوں سے جب اپنا حصہ مانگیں گے
ایک کھیت نہیں ایک دیس نہیں ہم پوری دنیا مانگیں گے

پانچواں سیشن

پائیدار ترقی اور موسمی تبدیلی

سندھ میں سیلاب اور کسانوں پر اثرات

ماسٹر انور علی چاچڑ

پاکستان کسان مزدور تحریک کے ممبر اور سندھ میں کچے کے رہائشی ماسٹر انور علی چاچڑ نے سندھ میں سیلاب اور کسانوں پر اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں خود کچے کے علاقے کا رہائشی ہوں۔ دریائے سندھ کے دونوں اطراف کے علاقے کچے کے علاقے کہلاتے ہیں۔ یہاں دریا کے دونوں اطراف بند ہوتے ہیں۔ بند کی لمبائی پندرہ کلومیٹر سے زیادہ ہوتی ہے۔ 1965 سے 1972 کے عرصے میں یہاں خشک سالی آئی جس کی وجہ سے کچے کے ہاری شدید غربت میں چلے گئے۔ خشک سالی کے بعد 1974 میں بڑا سیلاب آیا۔ پھر 90 کی دہائی میں سیلاب آتے رہے۔ سیلاب کی مشکلات کچے کے لوگ پہلے بھی بھگتتے تھے اور اب بھی بھگت رہے ہیں لیکن 2010 کا سیلاب سو سالہ تاریخ کا بڑا سیلاب تھا۔ اس سیلاب کے نتیجے میں توڑی بند ٹوٹ گیا جس سے دریائے سندھ کے دائیں طرف کے تمام اضلاع ڈوب گئے۔ جو لوگ دریا کے شمال اور مغرب کی طرف رہائش پذیر تھے وہ توڑی بند ٹوٹنے سے شدید مشکلات کا شکار ہوئے۔ ہمارے علاقے میں شیخ بند ٹوٹنے کے نتیجے میں دو بڑی آبادی والے گاؤں حبیب اللہ چاچڑ اور محمد یوسف چاچڑ مسمار ہوگئے اور موئن جو ڈرو جیسے نظر آنے لگے۔ ہمارا آبائی گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ اس کا ابھی تک کوئی نشان نہیں ملا ہے۔ ہمارے علاقے میں ریت کے ٹیلے بن گئے تھے۔ کچے کے زیادہ تر لوگ غریب ہیں۔ پکے کی نسبت کچے کے علاقے میں فصل بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہاں پانی میٹھا ہے۔ گندم کا سندھی تھوڑی کا اصل بیج دریا کے دونوں کنارے مل جاتا ہے۔ اس بیج کی یہ خاصیت ہے کہ یہ دریا کے کنارے بغیر پانی اور کھاد کے پیداوار دیتا ہے۔ دریا کے کنارے سبزیاں زیادہ اگتی ہیں۔ 1998 میں نواز شریف نے کچے کے کچھ لوگوں کو مالکانہ حقوق دیئے تھے لیکن زیادہ تر کے پاس مالکانہ حقوق نہیں ہیں۔

پاکستان کسان مزدور تحریک اور موسمی انصاف

راجہ مجیب

پی کے ایم ٹی اور موسمی انصاف کے موضوع پر بات کرتے ہوئے راجہ مجیب ماسٹر انور علی نے سیلابوں کی تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے پہلے 1973، 1992 پھر 2010 کے سیلابوں کے حوالے سے بات کی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جن دہائیوں کا انھوں نے ذکر کیا ان میں سیلابوں کے آنے کے دورانئے میں کہیں سات سال، کہیں چودہ اور کہیں پانچ سال کا وقفہ تھا۔ مگر کچھ عرصے سے اس طرح کے واقعات تسلسل سے رونما ہو رہے ہیں۔ کوئی ایسا دن اور سال نہیں گزرتا جب اس طرح کے واقعات پر بحث ومباحثہ نہیں ہو رہا ہو۔ موسمی تبدیلی کے بڑے واقعات میں سے چند آپ کے سامنے بیان کروں گا۔ اکتوبر 2005 میں کشمیر میں بڑا زلزلہ آیا۔ جون 2007 میں سندھ کے سات علاقوں اور بلوچستان کے چھ علاقوں میں سیلاب آیا۔ 2010 کا سیلاب جولائی سے اگست کے مہینے کے درمیان آیا جس سے سندھ، پنجاب، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے کئی علاقے متاثر ہوئے۔ اگست اور ستمبر 2011 میں جنوبی سندھ میں شدید بارشوں سے سندھ کے نو اضلاع متاثر ہوئے۔ ستمبر 2012 کے دوسرے ہفتے میں شدید بارشوں کے نتیجے میں سیلاب آیا۔ ان تمام واقعات کے رونما ہونے کے مہینوں کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ سلسلہ آگے بڑھتا نظر آئے گا۔ پاکستان میں مون سون کا سیزن جون سے جولائی کے مہینہ میں ہوتا ہے۔ پچھلی تاریخ بتاتی ہے کہ ان مہینوں میں سیلاب بھی آئے اور بارشیں بھی ہوئیں۔ لیکن کچھ سالوں سے ان کے دورانئے میں تبدیلی آرہی ہے۔ مون سون کا موسم گزرنے کے بعد ہمارے کسان سمجھتے ہیں کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اسی سوچ پر وہ اپنی فصلیں کاشت کرتے ہیں لیکن موسمی تبدیلی نے ہماری کسان آبادیوں کو دھوکا دیا ہے۔ زبیدہ بروانی نے جیسے کہا کہ سمندر بڑھ رہے ہیں اور بارہ لاکھ ایکڑ زمین سمندر کھا رہا ہے یعنی ہر دن 80 ایکڑ زمین سمندر نگل رہا ہے۔ جیسے ڈاکٹر روبینہ سہگل نے بتایا کہ امیر ممالک اس موسمی تغیر کے ذمہ دار ہیں لیکن وہ غریب ممالک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کاربن گیس کا بے تحاشہ اخراج پہلی دنیا کے سرمایہ دار ممالک کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال و استحصال امیر ممالک کی آسائشوں کو پورا کرنے کے لیے ہو رہا ہے۔ تیسری دنیا کی آبادیاں یہ آسائشیں استعمال نہیں کر رہی ہیں تو ہم پر یہ الزام کیوں تھوپا جا رہا ہے؟ ماحول کو خراب کرنے والا ہمارا سرمایہ دار طبقہ ہے۔ ان کی صنعتوں نے ماحول کو تباہ کیا ہے۔ یہاں سے ناانصافی شروع ہوئی ہے۔ Kyoto Protocol جو موسمی تبدیلیوں اور اس کے انصاف کے حوالے سے بنا تھا، اسے سب سے زیادہ امریکہ اور امیر ممالک نے رد کیا ہے۔

پاکستان کسان مزدور تحریک کا اس حوالے سے واضح کردار ہونا چاہیے کہ وہ موسمی انصاف کے حوالے سے کہاں

کھڑی ہے۔ اگر ہم انصاف کے لیے لڑ رہے ہیں تو اس کی شروعات ہمیں اپنے آپ سے کرنی ہوگی۔ زارعت میں کمپنیوں کو رد کر کے اپنے بیج کو بچانا ہوگا۔ زہر کو ختم کرنا ہوگا جو ماحول کو خراب کرنے کا ذمہ دار ہے۔ آخر میں ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

امیر شہر سے میری فقط اتنی لڑائی ہے
میں ایسے سر بناتا ہوں جنھیں جھکنا نہیں آتا

موسمی تبدیلی: جائزہ اور تجزیہ

نوید اقبال

موسمی تبدیلی کے حوالے سے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے نوید اقبال کا کہنا تھا کہ پی کے ایم ٹی یہ واضح موقف رکھتی ہے کہ سامراجی طاقتوں کی صنعتوں سے نکلنے والے دھوئیں کی وجہ سے کاربن گیس کا اخراج بڑھ گیا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ سورج کی توانائی کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب فضاء میں اس کا اخراج بڑھ جاتا ہے تو اس گیس کی ایک ڈھال دنیا کے اردگرد بنتی جاتی ہے۔ یہ ڈھال سورج سے آنے والی توانائی کو جذب کر کے واپس خلاء میں جانے سے روکتی ہے جس سے زمین کی حدت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح پہلی دنیا کی صنعتوں سے اٹھنے والا دھواں موسمی تبدیلی کی وجہ بنتا ہے۔

موسمی تبدیلی کو سمجھنا کیوں ضروری ہے؟ ہم کسانوں کی محفل میں بیٹھے ہیں۔ تمام کسان آبادیاں اپنے کھیتوں میں موسم کو سمجھتے ہوئے کاشت کاری کرتی ہیں۔ جب موسم تبدیل ہوتا ہے تو آنے والی پوری پیداوار متاثر ہوتی ہے۔ جیسے راجہ مجیب نے کہا کہ مون سون کا سیزن موسمی تبدیلی کی وجہ سے آگے بڑھ رہا ہے، جو بارش ہمیں کسی خاص وقت پر چاہئے ہوتی تھی وہ اس وقت پر نہیں ہوتی۔ اس سال بہت سیلابی بارشیں ہوئیں۔ 2011 میں بھی بارشیں ہوئی۔ 2010 میں بڑا سیلاب آیا۔ ہم مسلسل تین سال سے موسمی تبدیلی کا شکار ہیں۔ اس سال کپاس کی فصل چننے کے لیے تیار تھی پر وہ کسانوں کی آنکھوں کے سامنے ضائع ہوگئی۔ ہمیں اس معروضی حقیقت کو سمجھنا چاہئے کہ پوری ماحولیاتی تبدیلی سرمایہ داری اور سامراجی حکومتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ ہمارے کسانوں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ بیرونی کمپنیوں نے سیلاب کو موقع سمجھتے ہوئے ہائی برڈ بیج کسانوں میں تقسیم کیے۔ ایک طرف ہمارے روائتی بیجوں کا خاتمہ ہو رہا ہے، دوسری طرف ان کمپنیوں نے اپنا جال مزید پھیلانے کے لیے موسمی تبدیلی کو اپنا ہتھیار بنالیا ہے۔ ان حالات نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر

دیا کہ یہ سرمایہ داری نظام جو ترقی کا راگ الاپتا ہے ہمیں بالکل نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ پھر سمجھنے کی کاوشیں شروع ہوئیں۔ تیسری دنیا کے ممالک نے پہلی دنیا کے ممالک کو واضح کیا کہ جتنی بھی موسمی تبدیلی ہے، گرین ہاؤس گیسز کا اخراج بڑھنے کی وجہ ہے، جیسے راجہ مجیب نے Kyoto Protocol کا ذکر کیا جو 1997 میں آیا۔ اس کے بعد اگلے سیشن میں یہ طے ہوا کہ جو جتنا ماحول آلودہ کرنے کا ذمہ دار ہے وہ اتنا ہی اس ماحول کا ازالہ کرے گا۔ اس بنیاد پر پہلی دنیا زیادہ قصور وار ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے بہت بڑے پیمانے پر ماحولیاتی تبدیلی ہوئی جسے خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک جھیل رہے ہیں۔ ابھی یہ سارے بحث ومباحثے چل رہے ہیں، کہیں بھی کوئی بات طے نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً زیر زمین ایندھن (فوسل فیول) کے جلنے سے گیسز پیدا ہوتی ہے۔ امیر ممالک اس کا حل یہ دیتے ہیں کے فصلوں سے ایگروفیول پیدا کرکے ہم کاربن گیسز کے اخراج سے بچ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ زمینوں پر قبضہ بھی کرتے ہیں اور جنگلوں کا صفایا بھی کرتے ہیں۔ جب جنگلات کٹتے ہیں تب بھی بہت زیادہ کاربن گیسز پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سارے کے سارے حل ہمیں ایک ایسے ناپائیدار مستقبل کی طرف لے جا رہے ہیں جس میں ہماری دیہی آبادیوں کے لیے تحفظ نہیں ہے۔

موسمی تبدیلی کی بنیادی وجہ ہمیں سمجھ آ گئی۔ اب ہمیں کیا جدوجہد کرنی ہے؟ ہمیں سب سے پہلے اس سرمایہ داری نظام کی مذمت کرتے ہوئے اس کو رد کرنا چاہئے۔ یہ نظام بالکل لڑکھڑا رہا ہے۔ صبح کے سیشن میں ڈاکٹر عذرا نے جو اصلاح پسندی کی سیاست کے حوالے سے بات کی وہ سب اس نظام کو بچانے کے لیے کی جا رہی ہے۔ تیسری دنیا کی آبادی متحد ہو کر اپنے مستقبل کا فیصلہ اس باشعور سوچ کے ساتھ آگے بڑھائے کہ وسائل پر قبضہ یہاں کی مقامی آبادیوں کا ہونا چاہئے۔ ہمارے پاس اتنی صلاحیت اور جرات نہیں کہ ہم وسائل کو اپنے لیے جمع کر سکیں۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس کے پیچھے سامراجی قوتیں کارفرما ہیں؟ سامراجی قوتیں ہماری حکومتوں میں بیٹھے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے سے گٹھ جوڑ کرکے ہم پر اپنا ظلم مسلط کرتی ہیں۔ یہ باہمی گٹھ جوڑ کے ذریعے ہم سے اپنا سرمایہ بنواتے ہیں اور ہمیں مزید ظلم اور غربت کے اندھیروں میں دھکیل دیتے ہیں۔

ہم کس طرح کی پائیدار ترقی چاہئے؟ کیا ایگروفیول پائیدار ترقی کی بنیاد ہے؟ پہلی دنیا جس طرح کے حل پیش کر رہی ہے وہ ہمارے مستقبل کو کس طرف لے جائے گا؟ اگر ہم نے مزاحمت نہیں کی تو پائیدار ترقی کے نام پر پہلی دنیا کے فیصلے ہم پر تھوپ دیئے جائیں گے۔ ہمیں بنیادی سوچ کو سمجھتے ہوئے مشترکہ طور پر خود انحصاری کی سمت جانا چاہئے۔ پہلی دنیا کی امداد سے نہ تو خوشحالی آسکتی ہے اور نہ ہی ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکتے ہیں۔ جب تک آبادیاں آپس میں بیٹھ کر فیصلہ نہیں کریں گی، پہلی دنیا کی بنیادی سوچ کی نفی نہیں ہوسکتی۔ یعنی مزدور کسان طبقہ اپنے وسائل پر قبضے

اورخودمختاری کی جنگ متحد ہو کر لڑنے کا فیصلہ کرے تا کہ مستقبل میں ہماری آنے والی نسلیں اس منزل تک پہنچ سکیں۔

پائیدار ترقی کے تناظر میں دن بھر کی کاروائیوں کا خلاصہ

عذرا طلعت سعید

آج کے اجلاس میں تمام موضوعات پائیدار ترقی کے ارد گرد زیر بحث لائے گئے ۔ اس مد میں ہم نے پانچ الگ الگ موضوعات پر بات کی۔ پہلے پائیدار زراعت اور ترقی کے حوالے سے بات کی گئی۔ پائیدار ترقی اور عورتوں کے مسائل اور ان پر تشدد کے حوالے سے خاص طور پر جو لوک تماشہ پیش کیا گیا اس میں صرف عورت کے ساتھ ظلم نہیں دکھایا گیا بلکہ معاشرے کے ہر پسے ہوئے طبقے کے ساتھ ظلم صاف نظر آیا۔ عورتوں کے مسائل پر بات کرنے کے بعد دیگر طبقوں کے مسائل پر بات کرتے ہوئے الگ الگ قدرتی وسائل کو ہم نے اپنے ساتھ جوڑا۔ اس میں جو بات ہمیں سمجھ آئی وہ یہ کہ ہمیں پائیدار ترقی کے اہداف ڈھونڈنے ہونگے۔ جب ہم آبادیوں کے مسائل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تین واضح ڈھانچے نظر آتے ہیں:

i۔ سرمایہ داری ii۔ جاگیرداری iii۔ پدرشاہی

زمینی قبضے کے پینل میں بات چیت سے غربت اور طبقاتی فرق واضح ہوئے۔ زمینی جدوجہد کا ذکر ہوا۔ پھر آخر میں نو آبادیات کا ڈھانچہ سامنے آیا۔ یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ پی کے ایم ٹی نے زمینی مشاورتوں کے ذریعے اپنا ایک ہدف بنایا ہے کہ زمین صرف برابری کی بنیاد پر تقسیم ہونی چاہئے۔

بیج کی سیاست پر بات ہوئی اس میں بھی سرمایہ داری اور سامراجیت کھل کر سامنے آئی۔ ظاہر اللہ کا کہنا تھا کے بیج ہماری اولاد کی طرح ہے۔ اسے بیچنا اخلاقی جرم ہے۔ دوسری واضح بات جو سامنے آئی وہ ظلم تھا کہ کس طرح بیجوں کی سیاست کے ذریعے خوراک پر قبضہ کیا جارہا ہے۔

جب ہم پائیدار ترقی کی بات کرتے ہیں تو پائیدار ترقی دو سطحوں پر ہے۔ ایک وہ جو ہمارے حق میں ہے اور دوسری وہ جو ہمارے حق میں نہیں ہے۔ تو آج کے سیشن میں جو باتیں سامنے نکل کر آئیں ان میں زمین کی منصفانہ تقسیم، بیج کا اپنا ہونا، خوراک پر اپنا کنٹرول شامل ہیں۔

غربت کی نشاندہی بار بار کی گئی کہ ہماری آبادیاں شدید غربت کا شکار ہیں اور ہمیں اس کا احاطہ کرنا پڑے گا۔

بہتر روزگار سے غربت خود بخود ختم ہوجاتی ہے۔

ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

1۔ جدوجہد 2۔ غلط کو صحیح کرنا

ہماری جدوجہد اور ذمہ داری ہے کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں، شعور اور اپنے نظریہ کو پھیلائیں۔ جو بھی علم ہم لوگوں سے حاصل کریں انھیں دوسروں تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔

موسمی تبدیلی میں لوگوں کے ساتھ ناانصافی اور سامراجیت سامنے آئی۔ سامراجیت ہمارے یہاں موسمی بحران کی ذمہ دار ہے۔ امداد بھی سامراجیت کی ایک شکل ہے۔ امداد بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک باہمی امداد دوسری سامراجی امداد۔ ان دونوں میں بہت فرق ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔

دوسرے دن کے اجلاس کی کاروائی

پی کے ایم ٹی، سال 2011-12 سرگرمیوں کا جائزہ

ظہور جوئیہ

پاکستان کسان مزدور تحریک کی گزشتہ سرگرمیوں کا جائزہ پیش کرنے کے لیے پنجاب سے پی کے ایم ٹی کے ممبر ظہور جوئیہ کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔

چوتھے سالانہ اجلاس کی کاروائی کا جائزہ

پی کے ایم ٹی کا چوتھا سالانہ اجلاس 16-15 دسمبر 2011 کو لاہور کے رینیول سینٹر میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا عنوان ''غذائی، معاشی، ماحولیاتی بحران : عوامی لائحہ عمل'' رکھا گیا۔ مختلف موضوعات پر پانچ سیشن دو دن کی کاروائی میں مکمل کئے گئے۔ ان موضوعات کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

- سرمایہ دارانہ نظام کا موجودہ بحران، ریو+20 کے حوالے سے زراعت سے جڑے مسائل پر گفتگو ہوئی۔
- عورتوں کے مسائل اور ان پر تشدد کے حوالے سے ایک لوک تماشہ پیش کیا گیا۔
- چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے حقوق پر بات کی گئی کہ کس طرح سندھ کے بے زمین کسان وڈیرانہ نظام کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہیں۔
- پاکستان کی دیہی آبادیوں کے بنیادی حقوق کے حوالے سے بات ہوئی۔
- پاکستان کے غذائی بحران پر معاشی تجزیہ پیش کیا گیا جس میں گراف اور اعداد و شمار کی مدد سے پاکستان میں خوراک کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی گئی۔
- فلپائن سے آنے والے مقررین نے قیمتوں کی عالمی سٹے بازی اور خوراک کے بحران پر پورے عالمی تناظر میں اپنا تجزیہ پیش کیا۔

چونکہ پی کے ایم ٹی کا سالانہ اجلاس سال کے آخر میں منعقد کیا جاتا ہے تو اس لیے 2011-12 کی ان منعقدہ سرگرمیوں کی تفصیلات پیش کی گئیں:

کور گروپ میٹنگ:

پی کے ایم ٹی کے کور گروپ کے سال میں تین اجلاس ہوئے جن میں سے دو لاہور اور ایک مری میں منعقد کیا گیا۔ ان اجلاسوں میں پی کے ایم ٹی کی سرگرمیوں کے حوالے سے سہ ماہی کی بنیاد پر منصوبہ بندی کی گئی۔

عوامی کارکن کی صلاحیت بڑھانے کے لیے ورکشاپ:

فلپائن سے بلائی گئی تربیت کار کے تعاون سے عوامی کارکنان کی صلاحیت کو بڑھانے کے لیے ورکشاپ منعقد کی گئیں۔ جن سے پی کے ایم ٹی کو دنیا بھر کی تحریکوں اور کسانوں کے حوالے سے مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

بی ٹی کاٹن پریس کانفرنس:

پنجاب میں بی ٹی کاٹن کی کاشت پر پابندی کے حوالے سے حکومت پنجاب کے اس اقدام کا خیر مقدم کرتے ہوئے ملتان میں ایک پریس کانفرنس کی گئی جس میں سندھ میں بھی بی ٹی کاٹن کی کاشت پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

نقلی بیجوں کے خلاف کسانوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے پریس کانفرنس:

میر پور خاص میں سورج مکھی کے نقلی بیجوں سے متاثرہ کسانوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے پی کے ایم ٹی اور متاثرہ کسانوں نے مل کے ایک پریس کانفرنس منعقد کی گئی جس میں میڈیا کو بتا یا گیا کہ کس طرح کمپنیوں کے نقلی بیجوں کی فروخت سے کسانوں کی فصلیں تباہ ہوئیں۔

کسانوں کا معلوماتی دورہ:

- ٹنڈو محمد خان سے ہری پور تک کسانوں کو معلوماتی دورہ کرایا گیا جس میں جنیاتی بیجوں کے خلاف سکھر، ملتان، ہری پور میں سیمینا رمنعقد کئے گئے ۔ اس دورے کے دوران راجن پور سے بھی کسان دوستوں نے شمولیت اختیار کی۔ ہری پور کے سیمینار میں بلوچستان کے دوست بھی شامل ہوئے ۔ ملتان اور سکھر میں ریلی اور مظاہرہ کا اہتمام کیا گیا۔ جنیاتی بیجوں کے خلاف سکھر، ملتان، ہری پور میں تھیٹر پیش کئے گئے ۔ راجن پور اور ہری پور میں کسان عورتوں کے ساتھ کچہری کی گئی۔ روائتی کھیتوں کے دورے بھی کرائے گئے ۔
- اس معلوماتی دورے کی خاص بات یہ تھی اس دورے کی قیادت قومی رابطہ کار علی اکبر نے کی تھی۔

زمینی اصلاحات: مشاورتی پروگرام:

- زمینی اصلاحات پر مشاورتی پروگرام صوبائی سطح پر سندھ، پنجاب، خیبر پختو خواہ میں منعقد کئے گئے ۔ جبکہ قومی سطح پر یہ پروگرام اسلام آباد میں منعقد کیا گیا۔ پنجاب کے اجلاس میں ڈاکٹر مبارک کی طرف سے تجویز آئی کہ زمینی اصلاحات کے بجائے زمین کی منصفانہ تقسیم کی بات کی جائے۔ ان تمام اجلاسوں کی ایک رپورٹ بھی شائع کی جا چکی ہے۔

کسان آبادیوں سے نئے رابطے:

- کسان آبادیوں سے نئے رابطے کے تحت سندھ میں بدین اور سکھر، پنجاب میں ملتان اور رحیم یار خان، خیبر پختو خواہ میں پشاور اور مانسہرہ میں کام کا آغاز کیا گیا۔

سیاسی تربیتی پروگرام:

- سندھ کے شہر سکھر اور حیدرآباد میں دو سیاسی تربیتی پروگرام کیے گئے۔
- پنجاب کے شہر ملتان اور رحیم یار خان میں دو سیاسی تربیتی پروگرام کیے گئے۔ جن میں راجن پور کے کسانوں نے بھی شرکت کی۔
- خیبر پختو خواہ کے شہر پشاور اور ایبٹ آباد میں دو سیاسی تربیتی پروگرام کئے گئے۔

عورتوں کا عالمی دن:

- عورتوں کے عالمی دن کے حوالے سے ملتان میں سوجھلا اور پی کے ایم ٹی کے تعاون سے ایک پروگرام اور ریلی منعقد کی گئی جس میں پی کے ایم ٹی سندھ کی طرف سے سونی اور شریک قومی رابطہ کار وینا ارجن نے شرکت کی۔
- گھوٹکی میں بھی اس حوالے سے سیمینار منعقد کیا گیا۔

ریو+20 کے حوالے سے تربیت:

- ریو+20 کے حوالے سے اسلام آباد میں ایک روزہ تربیتی پروگرام رکھا گیا۔
- ریو+20 کے حوالے سے سکھر میں ایک مظاہرہ کا اہتمام کیا گیا۔

عالمی دن برائے خوراک:

- خوراک کے عالمی دن کے حوالے سے کراچی یونیورسٹی میں ایک روزہ سیمینار منعقد کیا گیا۔
- پی کے ایم ٹی کی طرف سے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کی گئی۔
- عالمی دن برائے خوراک کو عدم خوراک کا دن قرار دیتے ہوئے حیدر آباد میں مظاہرہ کا اہتمام کیا گیا۔

پی کے ایم ٹی آئین کی منظوری

ولی حیدر

پاکستان کسان مزدور تحریک کے چوتھے سالانہ اجلاس میں پی کے ایم ٹی کا عبوری آئین زیر بحث لایا گیا تھا۔ اس روشنی میں پی کے ایم ٹی کا کور گروپ جو تمام فیصلہ سازی کرتا ہے، اس کا اجلاس نومبر 2012 میں منعقد کیا گیا، جس میں آئین کے مسئلے پر بات کی گئی اور فیصلہ ہوا کہ پانچویں سالانہ اجلاس میں اس عبوری آئین کو جس شکل میں موجود ہے منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا اور اگر اس اجلاس میں یہ منظور ہو جائے تو اس کو عبوری (Interim) آئین کا نام دے دیا جائے گا۔ پانچویں سالانہ اجلاس 2012 کے موقع پر اجلاس کے شرکاء نے عبوری آئین کو متفقہ طور پر منظور کرلیا اور طے پایا کہ 2013 کے سالانہ اجلاس میں عبوری آئین کو ممبران کے مشاورت کے ساتھ حتمی شکل دی جائے گی۔

چناؤ ضلعی اور صوبائی رابطہ کار

پاکستان کسان مزدور کے چوتھے سالانہ اجلاس میں جمہوری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخواہ کے ممبران کی باہمی مشاورت کے نتیجے میں نئے قومی، صوبائی اور ضلعی رابطہ کاروں کا چناؤ عمل میں لایا گیا۔ اس اجلاس میں تمام صوبوں کی مشاورت سے صوبہ بلوچستان سے جڑے ساتھیوں میں سے فوکل پرسن کا چناؤ بھی کیا گیا۔

تاثرات

علی اکبر

سابقہ قومی رابطہ کار علی اکبر نے نئے قومی، صوبائی اور ضلعی رابطہ کاروں کے چناؤ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے محترم ساتھیوں نے قیادت نسل در نسل منتقل کرنے کی روایت ڈالی ہے۔ ہماری تحریکوں میں بھی لوگ تاحیات

صدر بن جاتے ہیں ۔ ہم نے یہ روایت توڑ ڈالی ہے اور یہ سلسلہ آئندہ بھی اسی طرح چلتا رہے گا۔ ہم اپنی محنت ، تنظیم کاری اور جدوجہد سے اس تنظیمی عمل کے کام کو جاری رکھیں گے۔

راجہ مجیب

نئے منتخب قومی رابطہ کار راجہ مجیب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے منتخب ہونے والے ضلعی اور صوبائی رابطہ کاروں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میں بحیثیت قومی رابطہ کار رابطے کو مزید مضبوط کروں گا نہ کہ اس کرسی پر غرور کروں گا۔ جیسے علی اکبر نے کہا کہ ہمیں سیاسی سوچ کے ساتھ کام کو آگے بڑھانا ہے، میں علی اکبر کی مشاورت کے ذریعے اپنے کام کو آگے بڑھاؤں گا۔ہم سیاسی ہیں اور سیاسی رہیں گے اور سیاسی کارکن کے طور پر کام کو آگے بڑھائیں گے۔

اختتامی کلمات

عبدالخالق

صوبہ بلوچستان سے پاکستان کسان مزدور تحریک کے ممبر عبدالخالق نے اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا ہیں کہ بلوچستان کا مسئلہ سب کے سامنے ہے۔ پوری دنیا جانتی ہے کہ بلوچستان میں کیا ہورہا ہے۔لیکن جو سب سے بڑا مسئلہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ کہ ایک گروپ بلوچستان کی آزادی کی بات کرتا ہے اور دوسرا گروپ بلوچستان میں دہشت گردی ختم کر نے اور امن کی بات کرتا ہے۔ دونوں گروپ اپنے مفاد کی بات کرتے ہیں۔کسان، مزدور کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ جاگیردار، نواب، حکمران اور جرنیل ایک بار پھر کسان اور غریب مزدوروں کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اصل مسئلے سے توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ روبینہ سہگل صاحبہ نے کہا کے امیر ممالک کا کہنا ہے کہ غریب زیادہ بچے پیدا کر رہا ہے ۔ ادھر آزادی کے نام پر غریب کسانوں کو کلاشنکوف دے کر پہاڑوں پر بٹھا یا گیا ہے۔غریب مر رہے ہیں اور لاپتہ ہورہے ہیں۔ دوسرا گروپ امن کے نام پر غریب سپاہیوں کو چھاؤنیوں کے دفاع کے لیے سخت سردی میں پہرہ دینے پر مجبور کرتا ہے جبکہ میجر، کرنل اپنے بنگلوں میں آرام سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ہمیں یہ علم ہونا ضروری ہے کے بلوچستان کی موجودہ جنگ ہماری جنگ نہیں ہے۔ کچھ بیرونی طاقتیں بھی بلوچستان کے حالات کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں پی کے ایم ٹی کے ممبران اور روٹس کے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ بلوچستان کہ لوگوں کو پائیدار ترقی کے حوالے سے شعور دینے میں ہماری مدد کریں۔

ضمیمہ نمبر 1 پروگرام

پاکستان کسان مزدور تحریک

سالانہ اجلاس، 11-10 دسمبر، 2012

رینیول سنیٹر، لاہور

10 دسمبر، 2012 پہلا سیشن: پائیدار ترقی

وقت	موضوع	مقرر	شعبہ / تعلق
09:00-09:20	افتتاحی کلمات	علی اکبر، نوین حیدر	قومی رابطہ کار اور چیئرپرسن پی کے ایم ٹی
09:20-09:35	پائیدار ترقی: طبقاتی تجزیہ	روبینہ سہگل (کی نوٹ اسپیکر)	دانشور
09:35-09:45	کسان کی نظر میں پائیدار زراعت	محمد صابر	کسان، ممبر پی کے ایم ٹی
09:45-10:00	پائیدار ترقی ایک مفصل جائزہ	ڈاکٹر عذرا طلعت سعید	روٹس فار ایکوٹی
10:00-10:15	سوال وجواب		

دوسرا سیشن: پائیدار ترقی اور عورتوں کے مسائل

وقت	موضوع	مقرر	شعبہ / تعلق
10:15-10:30	پدرشاہی نظام اور عورتوں کے مسائل	سونی	پی کے ایم ٹی سندھ
10:30-10:45	سرمایہ داری نظام اور عورتوں کے مسائل	ثمینہ جعفری	سوجھلا ملتان
10:45-11:00	عورت اور جاگیرداری نظام	ثمینہ ناز	روشنی، گھونگی
11:00-11:15	چائے		
11:15-11:30	پائیدار ترقی اور عورتوں کے مسائل	نیلم حسین	سیمورگ، لاہور
11:30-11:45	عورتوں کے حقوق: جدوجہد اور تدابیر	علی اکبر	پی کے ایم ٹی، خیبر پختونخواہ
11:45-12:00	سوال وجواب		

تیسرا سیشن: زمین پر قبضہ اور زمینی اصلاحات

وقت	موضوع	مقرر	شعبہ / تعلق
12:00-12:10	زمین پر اجارہ داری اور کسان پر اثرات	سہت	پی کے ایم ٹی، سندھ
12:10-12:30	شہری ترقی کے منصوبوں کے ذریعے زمین پر اجارہ داری	زبیدہ بروانی	ٹی سی سی آر
12:30-12:40	پاکستان میں زمین پر بیرونی سرمایہ کاری کے اثرات: الظاہرہ کیس	ارشاد سومرو	روٹس فار ایکوٹی
12:40-12:50	زمین پر اجارہ داری کے خلاف جدوجہد کا تاریخی پس منظر	طارق حسین	کراچی یونیورسٹی
12:50-1:00	پائیدار ترقی: پاکستان میں زمینی اصلاحات	محمد رفیق	پی کے ایم ٹی، ہری پور
1:00-1:15	سوال وجواب		
1:15-2:00	کھانا		

چوتھا سیشن: پائیدار ترقی اور بیج کی سیاست

وقت	موضوع	مقرر	شعبہ / تعلق
02:00-02:30		سوجھلا تھیٹر ٹیم	سوجھلا، ملتان
02:30-02:40	کمپنیوں کی بیج پر اجارہ داری: کسانوں پر اثرات	اسماعیل گورچانی	ممبر، پی کے ایم ٹی، سندھ
02:40-02:50	پائیدار زراعت میں بیج کا کردار	ظاہر اللہ	ممبر، پی کے ایم ٹی، خیبر پختونخواہ
02:50-03:05	بیج کی سیاست	ولی حیدر	روٹس فار ایکوٹی
03:05-03:15	سوال وجواب		
03:15-03:30	چائے		

پانچواں سیشن: پائیدار ترقی اور موسمی تبدیلی لوک تماشہ: عورت

وقت	موضوع	مقرر	شعبہ / تعلق
03:30-03:45	سندھ میں سیلاب اور کسانوں پر اثرات	ماسٹر انور علی چاچڑ	کسان ممبر، پی کے ایم ٹی، سندھ
03:45-04:00	پی کے ایم ٹی اور موسمی انصاف	راجہ مجیب	ممبر، پی کے ایم ٹی سندھ
04:00-04:15	موسمی تبدیلی: جائزہ اور تجزیہ	نوید اقبال	روٹس فار ایکوٹی
04:15-04:30	پائیدار ترقی کے تناظر میں دن بھر کی کاروائیوں کا خلاصہ	عذرا طلعت سعید	روٹس فار ایکوٹی
04:30-04:45	سوال وجواب		

08:30-11:00رات	پاکستان کسان مزدور تحریک یک جہتی محفل

11 دسمبر، 2012

وقت	موضوع	مقرر	شعبہ / تعلق
09:00-09:30	پہلے دن کا جائزہ اور تبادلہ خیال		
09:30-10:00	پی کے ایم ٹی سال 2011 سرگرمیوں کا جائزہ	ظہور جوئیہ	پی کے ایم ٹی، ملتان
10:00-10:30	پی کے ایم ٹی آئین کی منظوری	ولی حیدر	سیکریٹری، پی کے ایم ٹی
10:30-11:45	چناؤ ضلعی اور صوبائی رابطہ کار	صوبائی گروپ میٹنگز	
12:00-01:00	صوبائی گروپ کی کاروائی رپورٹ		
01:00-01:15	اختتامی کلمات	عبدالخالق	پی کے ایم ٹی، بلوچستان
01:15-2:00	کھانا		

شائع کردہ: روٹس فار ایکوٹی

تعاون: میزیریور